

طوفان بلا خیز سے پہلے

موسمیات کے تناظر میں پاکستان کیلئے سرکتے لحوں کی کہانی

'پہاڑ بھی اچانک نہیں گرتا۔ وہ تو بس ریاست کے غافل پڑے رہنے کا
انتظار کرتا ہے۔ بقا اور آفات سے مقابلے کی صلاحیت کنکریٹ سے نہیں،
حقائق کا سامنا کرنے سے تعمیر ہوتی ہے۔'

شفقت عزیز ملک

طوفان بلا خیز سے پہلے

موسمیات کے تناظر میں پاکستان کیلئے سرکتے لحوں کی کہانی

'پہاڑ بھی اچانک نہیں گرتا۔ وہ تو بس ریاست کے غافل پڑے رہنے کا انتظار کرتا ہے۔
بقا اور آفات سے مقابلے کی صلاحیت کنکریٹ سے نہیں، حقائق کا سامنا کرنے سے تعمیر ہوتی ہے۔'

شفقت عزیز ملک

طوفانِ بلاخیز سے پہلے موسمیاتی خطرات اور ترقیاتی امور کے گڑھ بنتا ناول ہے

مصنف: شفقت عزیز ملک - سٹریٹجک پالیسی ایڈوائزر، فریڈم گیٹ پراسپریٹی (FGP)

پہلا ایڈیشن: 2026

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ: ©2026 فریڈم گیٹ پراسپریٹی اور جناب شفقت عزیز ملک

ناشر: فریڈم گیٹ پراسپریٹی (FGP) مکان نمبر 01، اسٹریٹ 58، ایف-7/4، اسلام آباد-44000، پاکستان

ویب سائٹ: www.fgp.org.pk ای میل: info@fgp.org.pk

آئی ایس بی این (ISBN): 978-627-7991-11-1

قیمت 2000 پاکستانی روپے / 15 امریکی ڈالر

جملہ حقوق محفوظ (All Rights Reserved)

اس اشاعت کے تمام حقوق بحق ناشر و مصنف محفوظ ہیں۔ ناشر کی پیشگی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب یا اس کے کسی بھی حصے کو کسی بھی شکل میں خواہ وہ الیکٹرانک ہو، میکینیکل ہو، فوٹوکاپی ہو، ریکارڈنگ ہو، یا معلومات کو محفوظ اور بازیافت کرنے کا کوئی دوسرا نظام ہو دوبارہ تیار کرنے، محفوظ کرنے یا منتقل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

وضاحتی نوٹ (Disclaimer)

یہ تصنیف خالصتاً افسانوی (Fiction) ہے۔ اگرچہ اس کی بنیاد حقیقی ماحولياتی اور زمینی چیلنجز پر رکھی گئی ہے، مگر تمام نام، کردار، مقامات اور واقعات یا تو مصنف کے تخیل کی پیداوار ہیں یا انہیں افسانوی رنگ میں استعمال کیا گیا ہے۔ کسی بھی حقیقی شخص (زندہ یا مردہ) یا حقیقی واقعے سے کوئی بھی مشابہت محض ایک اتفاق ہوگی۔

کاوش۔ ماہرین کی نظر میں

نجمہ صدیقی (سوشل سائنسٹ، مصنفہ اور شاعرہ)

"اب وقت آ گیا ہے کہ جن مسائل پر ہم قومی اور عالمی سطح پر صرف نظریاتی بحثیں کرتے ہیں اور معاشرے کے ہر طبقے میں جن کا استحصال کیا جاتا ہے، انہیں ایک جیتے جاگتے انسان کا چہرہ دیا جائے۔ شفقت عزیز ملک پر پورا بھروسہ رکھیں کہ وہ اس کٹھن چیلنج کا بیڑا اٹھائیں گے! انہوں نے عوام اور مقامی برادریوں کی جدوجہد اور ان کی طاقت کو بھی بہت قریب سے دیکھا ہے، اور انتظامیہ، ان کے مالیاتی سرپرستوں اور ان کے امدادی ڈھانچے کی بے حسی کو بھی۔ وہ اپنے مشاہدات، گہری حساسیت، تخیل اور صحافت و ترقیاتی شعبے کے اپنے طویل تجربے کو ایک جگہ جمع کر کے ایک ایسی کہانی بناتے ہیں جو ہمیں ایک سچی اور حقیقت پسندانہ دنیا کے سفر پر لے جاتی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی دکھاتی ہے کہ اس طوفان کے دوسرے پار کیسے پہنچنا ہے! یہ کہانی اس سے حاصل ہونے والے اسباق اور ان پیغامات کے لیے ضرور پڑھی جانی چاہیے جنہیں ہم ایک طویل عرصے سے پس پشت ڈالتے آرہے ہیں۔"



ڈاکٹر وقار احمد (سابق سول سرونٹ اور ماہر معاشی امور)

"میں روزانہ پالیسی رپورٹیں پڑھتا ہوں۔ مگر اس ناول نے مجھے ان کا غذی اعداد و شمار کے پیچھے چھپی ناکامیوں اور المیوں کو گہرائی سے محسوس کروایا ہے۔ 'طوفانِ بلاخیز' سے پہلے محض ایک کہانی نہیں ہے، بلکہ یہ پورے جمود کے شکار نظام کے لیے ایک زوردار جھٹکا ہے۔ یہ آپ کو دکھاتا ہے کہ کس طرح ٹبرماfi کی وجہ سے پورے پہاڑ بہہ رہے ہیں، کس طرح ایک گلشیر کا سونامی پوری وادی کا نام و نشان مٹا دیتا ہے، اور کس طرح ایک نڈر صحافی سچ کہنے کی پاداش میں ہر لالچ اور سنگین خطرے کا مقابلہ کرتی ہے جبکہ حرص و ہوس کی طاقتیں اس کا منہ بند کرنا چاہتی ہیں۔ اور سب سے طاقتور بات جو میں نے پہلے نہیں سوچی تھی، وہ یہ ہے کہ کس طرح یہ ماحولیاتی آفات خواتین کو خاموشی کی دلدل میں دھکیل دیتی ہیں، یہاں تک کہ چند باہمت لوگ اٹھتے ہیں اور اس شرم اور جھجک کو ایک قومی قانون میں بدل دیتے ہیں۔ شفقت عزیز ملک کی یہ پیشکش آپ کو پہلے غصہ دلانے گی، پھر امید جگائے گی، اور آخر میں عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار کر دے گی۔ اسے اٹھائیے، آپ اسے آخر تک پڑھے بغیر میز پر رکھ نہیں پائیں گے۔"



فرمان علی (ایگزیکٹو ایڈیٹر دی ہائی ایشیا ہیرالڈ، سابق سٹی ایڈیٹر دی ایکسپریس ٹریبیون 'نیوز ایڈیٹر ڈیلی ڈان'، اسلام آباد)

"دودھانیوں سے زیادہ عرصے سے میں شفقت عزیز ملک کی لگن، ان کے ترقی پسند نظریات اور ان کے کام کا گواہ رہا ہوں۔ انہوں نے اقتدار کے ایوانوں سے لے کر کچی آبادیوں کی ٹوٹی پھوٹی گلیوں تک، اور صحافت کے شور و غوغا سے لے کر پبلک پالیسی کی دھیمی پسے ہوئی چکی تک، پورے پاکستان کا سفر کیا ہے؛ وہ ہمیشہ کہانیوں کے پیچھے بھاگے اور حقائق کو کھود کر باہر لائے۔ انہوں نے یہ کام ایک ایسے پیشہ ور کی خاموش دیوانگی کے ساتھ کیا ہے جو جانتا ہے کہ ہر وہ سچ جسے چھپایا جائے، ایک ایسا ناسور بن جاتا ہے جو اندر ہی اندر وجود کو سڑا دیتا ہے۔ وہ اس مٹی کے زخموں اور زمین کے کچلے ہوئے طبقے (the wretched of the earth) کے دکھوں کے عینی شاہد رہے ہیں، اور یہ ناول ان کی اس طویل جدوجہد کا محض نچوڑ نہیں ہے، بلکہ مستقل بحران کا شکار معاشرے کے ایک رستے ہوئے زخم پر لگایا گیا ایک تیکھا اور گہرا کٹ ہے۔ مگر جس چیز نے مجھے واقعی متاثر کیا ہے، وہ صرف ان کا نظریہ نہیں بلکہ ان کا فنِ لطیف (craft) ہے۔ شفقت کے کام کی انفرادیت یہ ہے کہ انہوں نے اس خام اور برہنہ زمینی حقیقت کو لیا اور اسے مستقبل کی گونجتی ہوئی آواز میں بدل دیا۔ یہ کسی نعرے یا جذباتیت کے بغیر، آنے والے کل کی پکھی گئی سچائی اور ایڈووکیسی اور بیانیے کی ایک نئی شکل ہے۔ ان کے سینے میں ابھی کئی کہانیاں دفن ہیں۔ یہ تو محض ایک شروعات ہے۔ دعا کریں کہ یہ ان کی آنے والی کاوشوں کیلئے ایک سیل رواں ثابت ہو۔"



سجاد ظہر (مصنف، تاریخ دان، صحافی)

کچھ لوگوں کو ظاہری حسن عطا ہوتا ہے اور کچھ کو باطنی، بہت کم ایسا ہوتا ہے قدرت کسی پر اس قدر مہربان ہو کہ وہ اندر باہر ہر جانب سے یکتا ہو۔ شفقت عزیز مجھے صرف اس لیے عزیز نہیں بلکہ میرے لیے اس کا سب سے منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ اسے باطنی آنکھ بھی عطا ہوئی ہے جو آنے والے ساخت کو وقت سے پہلے بھانپ لیتی ہے۔ ”طوفانِ بلاخیز سے پہلے“ کے ہر صفحے پر مجھے ایک نوح نظر آتا ہے جو نفاذِ خدا بجا رہا ہے۔ فلاح کا راستہ پانیوالے بہت تھوڑے ہوتے ہیں، اتنے ہی جو ایک کشتی میں سما جائیں۔ فلم ’2012‘، آئی تو یہ کشتی تبت میں جکڑے لکھ رہی تھی۔ 2026ء میں یہ پاکستان کے شمالی علاقوں میں ڈوب رہی ہے۔ ملت کے گناہ صرف وہ نہیں



ہوتے جو جہاں ایک انسان دوسرے کا حق مارتا ہے بلکہ وہ بھی ہوتے جہاں بہت سارے انسان مل کر فطرت کا حق مارتے ہیں۔ طوفانِ بلا خیز جب دنیا میں آئے، اسی حق تلفی پر ہی آئے۔ شفقتِ عزیز کا کمال یہ ہے کہ اس نے ماحولیات کے موضوع کو اس اسلوب سے ناول میں ڈھالا ہے کہ اس پر کسی ماہر ناول نگار کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اتنے گھنجک موضوع پر کسی کا قلم بھی چلتا ہے جب اسے صرف زباں و بیان پر ہی دسترس نہ ہو بلکہ وہ معاملات کی تہہ تک غوطہ خوری کر چکا ہو۔ پاور کوریڈورز کے رولٹس کیسے کام کرتے ہیں اور ان کی پروگرامنگ کہاں سے اور کیسے ہوتی ہے؟ یہ سب کچھ شفقتِ عزیز کی باطنی آنکھ ہی دیکھ پاتی ہے۔ یہ محض ناول نہیں بلکہ ”طوفانِ بلا خیز سے پہلے“ کی ایک پکار ہے۔ اگر ہم نے اس پر کان نہ دھرے تو سندھ تہذیب ایک بار پھر قصہ پارینہ بن جائے گی۔

"فریڈم گیٹ پراسپرٹی (FGP) 'طوفان بلا خیز سے پہلے جس کا انگریزی ورژن' (Before the Valley Drowns) پہلے ہی شائع ہو چکا ہے، کوارڈو میں پیش کرنا ہمارے لیے باعث مسرت ہے۔ یہ تصنیف محض فکشن کا کوئی روایتی مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ عملی بیداری کی ایک پکار اور وہ آئینہ ہے جو آج کے پاکستان کو درپیش ماحولیاتی اور سماجی بحرانوں کی سچی عکاسی کرتا ہے۔ اگرچہ موسمیاتی تبدیلیاں اور یہ بحران عام طور پر اعداد و شمار کی خشک اور مبہم زبان میں زیر بحث لائے جاتے ہیں، مگر یہ کتاب ان کا غذائی کھانوں کے پیچھے چھپی انسانی زندگی کی اصل اور سنگین قیمت کو پوری شدت کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔ یہ اشاعت ہمارے ادارے کے اندر موجود گہری مہارت اور فکری استعداد کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

اس ناول کے مصنف شفقت عزیز: ملک فریڈم گیٹ پراسپرٹی میں سٹرٹنگ پالیسی ایڈوائزر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پالیسی سازی اور ترقیاتی شعبے میں اپنے دہائیوں کے طویل زمینی تجربے کو اس کہانی کے تانے بانے میں سمو کر، انہوں نے وہ معرکہ سر کیا ہے جو روایتی تکنیکی رپورٹیں کبھی نہیں کر پاتیں: انہوں نے ان بے روح اعداد و شمار کو ایک جیتے جاگتے انسان کا چہرہ اور روح عطا کر دی ہے۔ ان کا یہ کام اس پیشہ ورانہ صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے جسے ایف جی پی (FGP) ہمارے ملک کی سب سے سنگین ماحولیاتی اور سماجی کمزوریوں سے نمٹنے کے لیے تیار کر رہا ہے۔ ایف جی پی میں ہم اس سچائی سے بخوبی واقف ہیں کہ حقیقی بقا، ریزیلیئنس اور آفت کا مقابلہ کرنے کی سکت صرف برہنہ حقیقت کا اعتراف کرنے اور اپنے اجتماعی مستقبل کی 'ٹک ٹک کرتی گھڑیوں' کا سامنا کرنے کے حوصلے سے جنم لیتی ہے۔

یہ کہانی ہمیں سوات کی ان گتھی اور درختوں سے محروم ڈھلوانوں سے لے کر جھل گسی کی تپتی اور پیاسی زمین اور بدین کی شور زدہ دھرتی تک کا سفر کرواتا ہے؛ جہاں ہم ٹبر ماریا کے تباہ کن اثرات، غیر قانونی ہجرت (ڈنگی) کے رستوں پر بھاگتے نوجوانوں کی معاشی مایوسی، اور آفات کے دوران خواتین کی صحت اور ان کے وقار سے جڑے ان چیلنجز کو دیکھتے ہیں جنہیں ہمیشہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس چیز نے اس تصنیف کو وقت کی ایک اہم ضرورت بنا دیا ہے، وہ اس کی اٹل اور بے باک سچائی ہے۔ یہ کتاب وقتی اور ہنگامی حل پیش کرنے والے 'سرکاری تماشوں' (sarkari theatre) کے ملمع کو اتار پھینکتی ہے اور حقیقی پالیسی اصلاحات کے ساتھ ساتھ مقامی برادریوں کی سطح پر موافقت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ اقتدار کے ٹھنڈے ایوانوں اور اس دھرتی کی تپتی مٹی کے درمیان ایک پل کا کام کرتی ہے، اور ہمیں بڑی سختی سے یاد دلاتی ہے کہ اگر اس مٹی کا ماحول اور اس کا سانس لینا ہی

دم توڑ گیا، تو ترقی کا کوئی بھی پودا یہاں کبھی اپنی جڑیں نہیں پکڑ پائے گا۔

ہمارا مشن سب کی شمولیت پر مبنی خوشحالی اور معاشرے کے محروم و پسماندہ طبقوں کو با اختیار بنانا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ شعور اور آگاہی ہی عمل کی طرف اٹھنے والا پہلا قدم ہے۔ خواہ آپ ایک طالب علم ہوں، پالیسی ساز ہوں یا اس ملک کے ایک فکر مند شہری، یہ صفحات ہمارے مستقبل کو مسما کر کرنے والے بحرانوں کا ایک مخلصانہ نچوڑ ہیں اور اپنے لوگوں کے تحفظ کی ایک سنجیدہ دستک ہیں۔ ہم یہ کتاب اس لیے شائع کر رہے ہیں تاکہ اس گہری سماجی بے حسی کو چیلنج کیا جاسکے اور ماحولیاتی انصاف (climate justice) کے لیے لڑنے والی ایک نئی نسل کو تیار کیا جاسکے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ یہ بیانیہ اپنے قارئین تک حد درجہ صراحت، فصاحت اور ادارتی پختگی کے ساتھ پہنچے، اس حتمی مسودے کو جدید لسانی وسائل کے ذریعے نکھارا گیا ہے۔ اس نے ہمیں روایتی قصہ گوئی (storytelling) اور جدید تکنیکی وسائل کو ایک ساتھ سمونے میں مدد دی تاکہ ہم اپنے قارئین کی بہتر علمی خدمت کر سکیں۔

فریڈم گیٹ پراسپریٹی کی جانب سے شفقت عزیز ملک کو ایک ایسا شاہکار تیار کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں جو جتنا جذباتی اور اثر انگیز ہے، اتنا ہی فکری اور علمی طور پر وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ میں ہمارے شراکت داروں، تعلیمی اداروں اور رسول سوسائٹی کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس بیانیے پر کھل کر بات کریں تاکہ ہم سب مل کر ایک ایسے پاکستان کی بنیاد رکھ سکیں جو جو ابده ہو، پائیدار ہو اور صحیح معنوں میں مضبوط ہو۔

مستقبل کو محفوظ بنانے کے اسی مشترکہ عزم کے ساتھ،

محمد انور

چیف ایگزیکٹو آفیسر، فریڈم گیٹ پراسپریٹی (FGP) اسلام آباد، 2026

مصنف کے قلم سے

دہائیوں سے میری زندگی دو بالکل الگ اور متضاد پاکستانوں کے درمیان ایک مستقل اور اعصاب شکن سفر کا نام رہی ہے۔ بحیثیت ایک صحافی اور بعد میں قومی و بین الاقوامی ترقیاتی شعبے میں کام کرتے مقتدر ایوانوں میں بطور پالیسی ایڈوائزر موجودگی بالکل مختلف تجربے رہے ہیں۔ میرے لئے اسلام آباد کے ان پرسکون، ٹھنڈے اور ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کام کرنا آسان تھا۔ مگر حقیقت سے جڑا کچھ بھی لکھنے اور پالیسی میں دھرتی کا اصل مقدمہ شامل کرنے کا تقاضا تھا کہ میں فیلڈ کے پتے ریگزاروں کا سفر کروں۔

شمال کے ان اکھڑتے اور ٹوٹے ہوئے پہاڑوں سے لے کر سندھ کے ڈوبتے ہوئے ساحلوں اور بلوچستان کے پیاسے، خشک سالی کے مارے میدانوں، اور اسی طرح عورتوں کی حفظانِ صحت کی نظر انداز ضروریات تک، میں نے ریاست کے کاغذی منصوبوں اور اس دھرتی کی اصل سچائی کے درمیان ایک ہولناک فاصلہ دیکھا ہے۔ ان برسوں میں میں نے جو کچھ دیکھا ہے۔ ایک طرف ہماری مقامی کمیونٹیز کا وہ ناقابلِ شکست صبر اور عزم، اور دوسری طرف نظام کی وہ سنگدلانہ بے حس اور طمع — ان سب مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے کم از کم بیس کتابوں کی ضرورت ہوگی۔

میں نے فرنٹ لائن پر کام کرنے والے ورکرز کی بہادری بھی دیکھی ہے، اور ان پالیسیوں کے افسوسناک نتائج بھی دیکھے ہیں جو انسانی زندگی کے اوپر کنکریٹ کو اولیت دیتی ہیں۔ میرے خیال میں وقت ایک ایسی عیاشی ہے جس کی بطور ملک و معاشرہ، ہمارے پاس زیادہ گنجائش باقی نہیں بچی۔ چنانچہ، 'طوفانِ بلاخیز' سے پہلے 'ترقیاتی شعبے کی کوئی روایتی سوانح نہیں ہے۔ یہ تو بس ان فوری اور آپس میں جڑے ہوئے بحرانوں کا ایک مخلصانہ اور ہنگامی نچوڑ ہے جو اس وقت ہمارے مستقبل کو تار تار کر رہے ہیں۔ یہ احاطہ کرتا ہے اس بے لگام کشائی کا جو بارش کو پتھروں کے قاتل طوفان میں بدل دیتی ہے، اس معاشی مایوسی کا جو ہمارے نوجوانوں کو ڈنکی ہجرت کے ان خونی اور تاریک راستوں کی طرف دھکیل دیتی ہے؛ اور اس گہری، ادارہ جاتی کم مائیگی کا جو موسمیاتی آفتوں کے دوران مجبور خواتین اور لڑکیوں سے ان کی صحت اور ان کا وقار تک چھین لیتی ہے۔

اخطرات کی رپورٹیں اور پالیسی کے مسودے میرے کام کا ڈھانچہ ضرور ہیں، مگر میں نے یہ سیکھا ہے کہ صرف اعداد و شمار بے حس کی ڈھال کو نہیں توڑ سکتے۔ ہمیں ایسے بیانیوں کی ضرورت ہے جو خطرات سے آگاہ کرتی ٹک ٹک کرتی گھڑیوں کی انسانی

قیمت دیکھنے پر مجبور کر دیں۔ اس کہانی کی روح خالصتاً میرے اپنے جیتے جاگتے تجربات سے کشید کی گئی ہے۔ اس کتاب میں آپ جن کرداروں سے ملیں گے، وہ محض کوئی افسانہ نہیں ہیں؛ وہ فرنٹ لائن پر ملنے والے جیتے جاگتے انسانوں کے اصل خاکے ہیں۔ یہ خیالات، یہ واقعات، یہ مخصوص نااہلیاں اور یہاں تک کہ یہ مکالمے میرے اپنے حقیقی تجربات پر مبنی ہیں، جنہیں شناخت کی حفاظت کی خاطر اور ان کی جدوجہد کی منطق سچائی کو برقرار رکھتے ہوئے فکشن کا روپ دیا گیا ہے۔ یہ کہانی خطرے کا ایک الارم ہے۔ میری بس اتنی ہی امید ہے کہ ہم اس کی آواز کو سن لیں، اس سے پہلے کہ پانی ہمارے اپنے دروازوں تک آ پہنچے۔

میں غیب کے علم پر دسترس نہیں رکھتا مگر اس ناول کا انگریزی ورژن تحریر کرتے وقت میں نے مستقبل کا ایک خواب اس میں شامل کیا تھا۔ قارئین کی بے حد دلچسپی کا حامل ہو گا کہ ناول کے ایک منظر نامے میں، میں نے دکھایا کہ وفاقی وزیر خزانہ خواتین کی حفظانِ صحت کی اشیاء سے متعلق ایک بڑے ٹیکس ریلیف کا اعلان کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم اس مطالبے کے حق میں بھرپور جدوجہد کر رہے تھے اور چند ہی ماہ میں ناول کا یہ حصہ حقیقت میں بدل گیا جب بجٹ برائے سال 2026-27 کا اعلان کرتے وزیر خزانہ نے ہو بہو ناول میں لکھے الفاظ کو اپنی تقریر میں شامل کر دیا۔ تلخ حقائق کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ، اچھے خواب ضرور دیکھنے چاہئیں، یقین محکم ہو تو ان کے پورے ہونے کی گھڑی بھی آ سکتی ہے۔

باب-1

سیل سنگبار

موسمِ برسات کا آخری حصہ۔ کالام، وادی سوات۔

دریائے سوات اب محض پانی کا ریلہ نہیں رہا تھا، بلکہ کچھڑ، صنوبر کے ٹوٹے ہوئے درختوں اور سسکتے ہوئے ماحول کی پکار کو اپنے دامن میں سمیٹتی ہوئی ایک متحرک دیوار میں بدل چکا تھا۔ پائن ویوگیسٹ ہاؤس کے کمرہ نمبر چار کے اندر، شایان ملک ایمر جنسی لیمپ کی اس مدہم ہوتی ہوئی سفید روشنی میں بیٹھا تھا جس کی بیٹری کا اشارہ بار بار سرخ ہو کر کسی بھی وقت ساتھ چھوڑ دینے کا پیشگی اعلان کر رہا تھا۔ مقامی بجلی دودن پہلے ہی اس طوفان کے آگے گھٹنے ٹیک چکی تھی۔

بدلتے ہوئے مون سون کے مزاج تلے وادی کے اس کمزور سوک ڈھانچے کے لیے یہ ایک معمول کی بات تھی۔ شایان نے تھکن سے چوراہے چرے پر ہاتھ پھیرا، جس کے تاثرات اس کے جڑوں کی سختی سے عیاں تھے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جس نے اپنی زندگی کی کئی دہائیاں اسلام آباد کے سیاسی اور پالیسی ساز ایوانوں کے چکر کاٹتے ہوئے گزاری تھیں، جہاں وہ آنے والی تباہی کی دستک کو خطرات کے جائزوں میں دکھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ مگر اس وقت، اس کی میز پر رکھی 'موسمیاتی تغیر اور بھائی رپورٹ' کی موٹی جلد باہر مچنے والی اس قیامت کا کوئی سدباب کرنے سے قاصر تھی۔

اس نے پورا ہفتہ پہاڑوں کی چوٹیوں جو صدیوں پرانے اشجار کی بے دریغ کٹائی کے باعث اب تیزی سے ان کی موجودگی سے خالی ہو رہی تھیں، پر گزارا تھا تا کہ اس نقصانِ عظیم کا درست اندازہ کیا جاسکے۔ طاقتور ہاتھوں کی اشیر باد نے مقامی 'ٹمبر فایا' کو بے خوف بنادیا تھا جس کے ہاتھوں پہاڑ کے قدرتی محافظوں (درختوں) کو بے دردی سے کاٹا جا رہا تھا۔ درختوں کے بنا زمین اب اپنی گرفت چھوڑ رہی تھی۔ اسی اثنا میں ایک بھاری دستک اسے گہری سوچوں سے باہر لی آئی اور اس نے اپنے سامنے دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلتے دیکھا جہاں گیسٹ ہاؤس کا مینیجر طارق خان چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے بھیگے ہوئے شلوار

قمیص سے پانی ٹپک کر فرش پر پھیلنے لگا تھا۔

"ملک صاحب! نکلیں یہاں سے!" طارق کی آواز میں ہمیشہ کی روایتی نرمی اور گرمجوشی مفقود تھی، اور اس کی جگہ خوف میں لپٹی اور ہانپتی ہوئی گھبراہٹ نے لے لی تھی۔ "آپ کو یہ کمرہ ابھی چھوڑنا ہوگا، فوراً! نیچے کا پورا بازار بہہ چکا ہے اور پانی اب معلق پل کے نیچے جھکے ہوئے چھوڑ رہا ہے۔" شایان فوراً اٹھ کھڑا ہوا، اس کا ذہن سائنسی تجزیوں سے نکل کر اب عملی صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے آمادہ ہو چکا تھا۔ اگر دریا پل کو چھو رہا تھا، تو اس کا مطلب تھا کہ سیلابی ریلہ تاریخ کی بلند ترین سطح تک پہنچ چکا تھا۔ "میری جیب؟" اس نے پوچھا۔

"وہ تو کچھ دیر میں ڈھنسن چکی ہے،" طارق نے گھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "مسجد کے پاس بلے تلے دبی پڑی ہے۔ ہم سب لوگوں کو اس عمارت کے پیچھے اونچی چوٹی کی طرف منتقل کر رہے ہیں۔ صرف وہی سامان اٹھائیں جسے آپ آسانی سے سنبھال سکیں۔ ہمارے پاس صرف تین منٹ ہیں، اس سے پہلے کہ یہ حفاظتی دیوار جواب دے جائے۔"

کمرے میں تنہا رہ جانے کے بعد، شایان نے روایتی نے خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے ضروری کاغذات اور بوٹے کو ایک واٹر پروف تھیلے میں ڈالا۔ اس کے بعد اس کا لیپ ٹاپ اور موسیقیاتی تبدیلیوں کی وہ بھاری رپورٹ تھی۔ جو اگرچہ اس پانی کے آگے بالکل بے سود تھی، مگر دارالحکومت کے ایوانوں میں لڑی جانے والی اگلی پالیسی جنگوں کے لیے بے حد اہم تھی۔ آخر میں، اس نے میز پر رکھی ایسی کے بیجوں اور کھجوروں کی ایک چھوٹی، مضبوط بندشیشی اٹھائی اور جیکٹ کی جیب میں ڈال لی۔ یہ اس کی وہ خوراک تھی جو نامساعد حالات میں کام کرتے وقت اسے معمولات سے جوڑے رکھتی تھی، خواہ فیلڈ ورک میں کچھ اور میسر نہ بھی آئے۔

جیسے ہی اس نے اپنا پٹھو بیگ کندھے پر اٹھایا، اس کے گھٹنوں میں درد کی ایک شدید لہر محسوس ہوئی۔ یہ کھیل کے میدانوں میں گزراے ہوئے برسوں کی نظر انداز چوٹوں کا وہ خاموش تحفہ تھا، جو اس نم اور تیز رفتاری سے ہونے والی تباہی کے بھیانک منظر نے اسے گنگ انداز کیا اور جیکٹ کی زپ ٹھوڑی تک چڑھائی۔ برآمدے میں قدم رکھتے ہی باہر مچنے والی تباہی کے بھیانک منظر نے اسے گنگ کر دیا۔ فضا میں گیلی مٹی اور کپکپے ہوئے صنوبر کی بورچی ہوئی تھی۔ شایان نے دیکھا کہ ایک عظیم الشان، صدیوں پرانا دیودار کا درخت، جس کی جڑیں زمین سے اکھڑ چکی تھیں، دریا کی بھری ہوئی موجوں میں کسی سوکھے تنکے کی طرح بہہ چلا جا رہا تھا۔ درخت گرتے ہیں، پہاڑی ڈھلوانیں بیٹھ جاتی ہیں اور دریا کا گلا گھٹ جاتا ہے۔

یہ تباہی کا وہ شاخسانہ تھا جسے وہ برسوں سے وزراء اور بیوروکریٹس کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا، اور اب یہ سب کچھ ایک ہولناک حقیقت بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہا تھا۔

"اس بکس کو پکڑو! اسے اوپر اٹھائے رکھو!" دریا کے شور کو چیرتی ہوئی ایک تیز اور رعب دار آواز گونجی۔ شایان نے مڑ کر دیکھا۔ چند گز کے فاصلے پر، اس پھسلن اور کچھڑ سے اٹی چوٹی کی طرف بڑھنے کی جدوجہد کرتی ہوئی زوبیہ تریشی دکھائی دی۔ اس نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ملک کے ایک بڑے نجی میٹ ورک کی تحقیقاتی رپورٹ تھی، جو ماحولیاتی کرپشن کے کچے چٹھے کھولنے اور اپنی بے باک صحافت کی وجہ سے جانی جاتی تھی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی، بلکہ وہ غصے میں تھی۔ وہ ایک بھاری، واٹر پروف "پیلیکن بکس" کو اس خطرناک ڈھلان پر کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی، جس میں بلاشبہ اس کے کیمرے کے ہارڈ ڈرائیوز اور غیر قانونی کٹائی کے کیمپوں کی ریکارڈ ڈیوڈ یوز موجود تھیں۔

شایان نے نوٹ کیا کہ کچھڑ میں زوبیہ کے بوٹ اپنی گرفت کھور ہے تھے اور وہ پیچھے کی طرف پھسل رہی تھی، اور بکس کا بھاری وزن اسے نیچے گرتی ہوئی حفاظتی دیوار کی طرف کھینچ رہا تھا۔ شایان نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ اس نے تین لمبے ڈگ بھرے، اس کے بوٹ کچھڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے اور اس سے پہلے کہ زوبیہ کے ہاتھ سے بکس کا ہینڈل چھوٹا، اس نے دوسری طرف سے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔

زوبیہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا، بارش کی موٹی بو چھاڑ کے پیچھے سے اس کی آنکھیں شایان کی آنکھوں سے ملیں۔ یہ وقت نہ تو تعارف کا تھا اور نہ ہی شکریہ ادا کرنے کا۔ "تین گننے پراو پر کھینچنا!" شایان دریا کے شور کے باعث زور سے چلایا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا، اس کے جڑے تختی سے بھیجنے ہوئے تھے۔ "ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین!" انہوں نے پوری طاقت سے زور لگایا۔ پیلیکن بکس مٹی کے اس پھسلنے ہوئے تودے کے اوپر آگیا اور زوبیہ ہانپتی ہوئی اس کے پیچھے اوپر چڑھ آئی۔ مگر یہ کامیابی بالکل ادھوری اور بے معنی تھی۔ وہ چوٹی، جس کی طرف طارق نے اشارہ کیا تھا، اب کوئی جائے پناہ نہیں تھی؛ بلکہ وہ ایک ایسا جزیرہ بن چکی تھی جو لمحہ بہ لمحہ سکڑ رہا تھا۔

دریائے صرف اپنے کنارے نہیں توڑے تھے، بلکہ اس نے اپنا پورا رخ ہی بدل لیا تھا، نیچے کے تمام کھیتوں اور باغات کو ملیا میٹ کرتے ہوئے وہ گیسٹ ہاؤس کے احاطے کے گرد گھیرا ڈال چکا تھا۔ وہ بھاگ کر گریناٹ کے ایک بہت بڑے، ہموار پتھر کے تودے پر چڑھ گئے۔ زمین کا وہ قدرتی لنگر جو صدیوں کے موسموں کا مقابلہ کر کے وہاں قائم تھا۔ ان کے نیچے، گیسٹ ہاؤس

کی عمارت زمین بوس ہو رہی تھی۔ شایان نے دیکھا کہ لمحوں میں وہ حفاظتی دیوار کسی کاغذ کی طرح مڑ گئی تھی۔ پانی اس سے ٹکرایا نہیں تھا، بلکہ اسے نگل رہا تھا۔ چند سیکنڈوں کے اندر، وہ عمارت جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا، اس سیاہ اور مٹیالے ریلے کا لقمہ بن چکی تھی۔

زوبیہ اپنے بکس کے پاس ڈھیر ہو گئی، اس کے ہاتھ مٹی اور زخموں سے چورتھے۔ اس نے شایان کی طرف دیکھا، بارش کے پانی کے نیچے اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ چکا تھا۔

"راستہ ختم ہو چکا ہے،" اس کی آواز دریا کے شور میں بشکل سنائی دی۔ "پورا پہاڑ نیچے آ رہا ہے،" شایان نے پانی کی اس ناقابل یقین مقدار کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر، دریا کے اس ہولناک شور کے پیچھے ایک خوفناک خاموشی نے جنم لیا۔

پانی ان کے گریٹائٹ کے اس تودے کے گرد جمع ہونا شروع ہوا، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ٹخنوں تک آ گیا۔ وہ غصے سے مٹی سے گندھا پانی ایک مقناطیسی اور نا دیدہ طاقت سے انہیں اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

شایان نے اپنے پٹھو بیگ کے پٹے کو مزید مضبوطی سے جکڑا۔ "ہمیں اور اوپر جانا ہوگا، ابھی!" مگر اب کوئی جگہ باقی نہیں بچی تھی۔ پانی ان کے گھٹنوں تک پہنچ گیا۔ شایان کو محسوس ہوا کہ پانی کی پوری وحشیانہ طاقت ان پر ٹوٹ پڑنے کو ہے۔

صنوبر کا ایک بہت بڑا، چھلا ہوا تختہ دریا کی موجوں سے میزائل کی طرح نکلا اور سیدھا ان کے پتھر کی طرف بڑھا۔ "نیچے ہو جاؤ!" شایان چیخا اور اس نے زوبیہ کو نیچے کی جانب دھکیل دیا۔ وہ ٹکراؤ ایک دھماکہ تھا۔ ان کے نیچے وہ عظیم پتھر کانپ اٹھا۔ پانی اس کے اوپر سے ایک سیاہ اندھیرے کی دیوار بن کر گزرا۔ شایان کو محسوس ہوا کہ اس کے بوٹ پتھر سے اکھڑ چکے ہیں۔ وہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے فضا میں معلق ہوا اور پھر دریا کے اس واشنگ مشین نما ریلے کے پیٹ میں سمو گیا۔

وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔ مٹی اس کے ناک اور منہ میں بھر چکی تھی۔ وہ نا دیدہ چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا، وہ گہرے اندھیرے میں توازن برقرار رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے جل رہے تھے اور اس ہوا کے لیے چل رہے تھے جو وہاں موجود ہی نہیں تھی۔

اچانک، پانی کے ایک تیز جھٹکے نے اسے اوپر پھینک دیا۔ اس کا سر سطح آب سے باہر نکلا اور اس نے طوفانی بارش کے درمیان ایک لمبی، ادھوری سانس کھینچی۔ طوفان کے اس دھندلے میں اس نے ایک منظر دیکھا۔ مطلق بے بسی کا ایک ایسا خوفناک

خاکہ جو روح کو کپکپا دے۔

تیس گز کے فاصلے پر، ایک مقامی شخص لکڑی کی ایک ٹوٹی ہوئی چھت کے شہتیر کو پکڑے پانی کے اس تیز ریلے میں لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ وہ شخص چیخ نہیں رہا تھا؛ اس کا چہرہ اس نادر خوف سے پتھر اچکا تھا جو صرف وہی جان سکتا ہے جو اپنی موت کو سامنے دیکھ لے۔ اگلے ہی لمحے، وہ شہتیر پانی میں ڈوبے ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا، اور وہ شخص اس بھورے جھاگ دار پانی کے نیچے غائب ہو گیا۔ وہ پھر اوپر نہیں آیا۔

شایان کے دل میں مایوسی کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ اس ٹوٹے ہوئے سینڈ میں، اس کے ذہن میں وہ ویڈیو بجلی کی طرح کوندی جس نے برسوں پہلے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ کوہستان کے وہ پانچ بھائی، جو ایک تیز سیلابی ریلے کے درمیان سکڑتی ہوئی چٹان پر کھڑے تھے۔ اور پھر وہ ایک اور خاندان، جس میں بوڑھے، مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے آسمان کی طرف دیکھتے رہے، اس سرکاری ہیلی کاپٹر کا انتظار کرتے رہے جو کبھی نہ آیا، یہاں تک کہ پانی اوپر اٹھا اور ان سب کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔

'یہ سب پھر ہو رہا ہے،' شایان نے سوچا، اور یہ تلخ احساس اس بخ بستہ سردی سے زیادہ اس کے وجود کو کاٹ رہا تھا۔ پانی ہمیں نگل جاتا ہے، ہم مدد کا انتظار کرتے ہیں اور کوئی بچانے نہیں آتا۔ اور پھر، دریا نے شایان کو دوبارہ نیچے کھینچ لیا۔ سردی اب اس کے پورے وجود میں سرایت کر چکی تھی، اس کے اعضاء سن ہو رہے تھے۔ جیسے ہی اس کے دماغ کو آکسیجن ملنا بند ہوئی، وقت ٹھہر سا گیا۔

وہ خوف اور گھبراہٹ آہستہ آہستہ دور ہونے لگی، اور اس کی جگہ اس کی زندگی کی فلم ایک انتہائی واضح مگر بکھری ہوئی تصاویر کی شکل میں اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگی۔ اسے اسلام آباد میں اپنی وہ میز نظر آئی، جو پالیسی ڈرافٹس اور 'میشنل ریپیلیٹس فریم ورک' کے کاغذات سے بھری پڑی تھی۔ سب ادھورا۔ اسے چہرے نظر آئے۔ اس کے ساتھی۔ زوبیہ، جو کچھڑ کے اس ڈھیر پر اپنی ویڈیو سنجانے کے لیے لڑ رہی تھی۔

اور پھر، ایک مدہم اور گہرا عکس — شالی وادیوں کا ایک ایسا چہرہ، جسے اس نے اپنے دل کے سب سے محفوظ اور پرسکون کونے میں چھپا کر رکھا تھا، کوئی ایسا شخص جس کے پاس وہ کام ختم ہونے کے بعد ہمیشہ کے لیے واپس جانا چاہتا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا، میں کسی اور کو بچانے کی کوشش کیلئے شاید باقی نہ رہوں۔“ اس نے دل ہی دل میں اس سے معذرت کی،

اور یہ معذرت اس سیاہ پانی میں گھل گئی۔ اور پھر، اس ساتھ چھوڑتے ہوئے دماغ کی اس عجیب و غریب صراحت کے ساتھ، ایک انتہائی عام مگر لرزادینے والا خیال اس کے ذہن سے نکرایا: 'آریا اور ایو'۔ اس کی بلی اور بے کے نام تھے۔ چشمِ تصور سے اس نے اپنی بلیوں کو دیکھا جو اس کے گھر کے دروازے پر خاموشی سے بیٹھی، اپنی ڈیس ہلاتے ہوئے اس رات کے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں، جو اب کبھی نہیں آنے والا تھا۔

اس نے دارالحکومت چھوڑنے سے پہلے ان کی دیکھ بھال کا عارضی انتظام تو کیا تھا۔ مگر اگر دریا نے اسے نکل لیا، تو انہیں کھانا کون کھلائے گا؟ کون بتائے گا انہیں کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والا اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا؟ اس قیامت خیز سیلاب کے پس منظر میں یہ ایک انتہائی چھوٹی اور معمولی بات تھی، مگر اس خیال نے اس کا دل اس ادھوری پالیسیوں سے زیادہ توڑ دیا۔ اس کا سینہ جکڑ گیا۔ پانی کو اندر کھینچنے کی وہ قدرتی جبلت اب ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ شایانِ ملک کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو موت سے ڈرتا ہو؛ اس نے اپنی پوری زندگی موسمیاتی تباہی کے اس گہرے کنوئیں میں جھانکتے ہوئے گزاری تھی۔ مگر وہ اس موت سے ڈرتا تھا۔ وہ اس آہستہ، گلا گھونٹ دینے والے دباؤ، جلتے ہوئے پھیپھڑوں اور بے بسی کے اس ہولناک احساس سے خوفزدہ تھا۔

"بس جو بھی ہو، جلدی ہو جائے،" اس نے اس بھرے ہوئے اندھیرے میں دعا کی، مٹی کے ذرات کی وجہ سے اس کی آنکھیں سختی سے بند تھیں۔ 'کوئی پتھر کپٹی پر لگ جائے۔ سانس کی ڈوری ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ جائے۔ مجھے یہ پانی نما مغلوبہ نہ پینا پڑے۔'

اس کا کندھا کسی انتہائی سخت چیز سے ٹکرایا۔ پانی میں ڈوبا کوئی بڑا تیا چٹان تھی۔ ایک تیز، سفید روشنی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی درد کی شدید لہر جس نے اس کی پسلیوں سے لے کر گردن تک کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

اور پھر، اچانک، دریا کی وہ وحشیانہ دنیا ایک مطلق، گہرے اندھیرے میں ڈوب گئی۔



روشنی سے پہلے، ایک تیز بوا سے ہوش میں لے کر آئی۔ آئیوڈین، روٹی اور فینائل کے اس تیز ڈس انفیکشن کی بو، جسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔

شایان نے آنکھیں کھولیں۔ روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ اوپر ایک ٹیڑھا میڑھا سا چھت کا پنکھا سستی سے گھوم رہا تھا۔ اس نے تھوک نکلنے کی کوشش کی، مگر اس کا گلا ایسا تھا جیسے ریگ مال اور سوکھی مٹی سے بھرا ہوا ہو۔

وہ ہسپتال کے بستر پر تھا۔ اس کی پسلیوں کے گرد ایک موٹا کینوس کا بینڈج مضبوطی سے بندھا ہوا تھا، اور اس کے زخمی ہاتھ کی پشت پر ایک آئی وی (IV) لائن لگی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کا ایک ایک پٹھا ایسا دکھ رہا تھا جیسے کسی نے ہتھوڑوں سے کچلا ہو۔

"تمہیں ہوش آگیا۔"

وہ آواز دائیں طرف سے آئی تھی۔ شایان نے دھیرے سے اپنا سر گھمایا، گردن کی تکلیف نے اسے کراہنے پر مجبور کر دیا۔

بستر کے پاس رکھی لوہے کی ایک زنگ آلود کرسی پر، چائے کا ایک چھوٹا کاغذ کا کپ تھا، زو بیہ بیٹھی تھی۔ وہ خود بھی خستہ حال لگ رہی تھی۔ اس کے بائیں ابرو کے اوپر ایک سفید پٹی لگی تھی، اس کے بال پیچھے ایک گیلے اور کبھرے ہوئے جوڑے کی شکل میں بندھے تھے، اور اس نے مردانہ ساز کی ایک بڑی جیکٹ پہن رکھی تھی جو واضح طور پر ہسپتال کے کسی عملے کی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں بالکل بیدار اور متحرک تھیں۔

"کہاں۔۔۔" شایان کے حلق سے ایک مدہم سی آواز نکلی، جو بمشکل ایک سرگوشی تھی۔

"سیدو شریف،" اس نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "ریسکیو ایئر لفٹ ہمیں کل صبح یہاں لے کر آئی تھی۔ تم تقریباً دو دن سے بے ہوش تھے۔"

شایان نے آنکھیں بند کر لیں، اس بخ بستہ پانی کی یادیں دوبارہ اس کے دماغ سے نکرائیں۔ "طارق؟ اور گیسٹ ہاؤس کے باقی لوگ؟"

زو بیہ نے اپنے کاغذ کے کپ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموشی طویل، بھاری اور دم گھونٹ دینے والی تھی۔ "کچھ بچ گئے،" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مگر نیچے کی وادی۔۔۔ شایان، سب ختم ہو گیا۔ سرکاری اعداد و شمار سینکڑوں میں ہیں۔ مگر اصل تعداد۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

شایان نے چھت کی اس دراڑ کو گھورا۔ وہ 'وائٹر بلیٹی رپورٹ' جو دریائے سوات کے پیٹ میں کسی مٹی کے ڈھیر تلے دبئی پڑی تھی۔ وہ تمام صفحات۔ وہ تمام وارننگز۔

"انہوں نے ہمیں بحرین کے پاس پانی کے ایک بھنور سے نکالا،" زوبیہ نے اپنی بات جاری رکھی، اس کی آواز میں اب روایتی صحافی سنجیدگی واپس آ رہی تھی۔ "مقامی لوگ رسیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ تم نے لوہے کی ایک چادر کو اس طرح جکڑ رکھا تھا جیسے تمہارے ہاتھ پتھر اچکے ہوں۔" وہ رکی، اس کا جائزہ لیا۔ "تم نے میری ویڈیوز، پچالیں، شایان۔ جب ہم نیچے گئے تو وہ بکس چٹانوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ میرے پاس وہ سب کچھ محفوظ ہے۔"

شایان نے دھیرے سے اس کی طرف دیکھا۔ "وہ ٹمبر کیپوں کی ویڈیوز؟"

"وہ برہنہ اور گنجه پہاڑ،" زوبیہ نے تصحیح کی، اس کی آنکھیں سخت ہو گئیں۔ "پہاڑ کے کھسکنے والے قدرتی زون سے میلوں اوپر، وہ نئے کٹے ہوئے درختوں کے مڈھ۔ وہی وجہ، جس کی وجہ سے پتھروں کو روکنے کے لیے وہاں کچھ باقی نہیں بچا تھا۔"

شایان کو محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں اپنی ٹوٹی پسلیوں کے درد کو چیرتا ہوا ایک گہرا، سیاہ غصہ بیدار ہو رہا ہے۔ یہ صرف ایک سیلاب نہیں تھا۔ یہ ایک جائے وقوعہ (Crime Scene) تھا۔ "وہ اسے 'آفتِ ناگہانی یا خدا کی مرضی' کہیں گے،" شایان نے اپنی بھاری آواز کو پوری طاقت دیتے ہوئے کہا۔ وہ وزراء، وہ سرکاری حکام۔ وہ ٹی وی پر آئیں گے، بین الاقوامی امداد کی اپیل کریں گے اور اسے ایک غیر معمولی قدرتی آفت قرار دیں گے۔ وہی۔ ایک خالص 'سرکاری تماشہ'۔"

"میں جانتی ہوں،" زوبیہ نے نرمی سے کہا اور اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کے کپ کو مروڑ دیا۔ "اور اسی لیے، ہم یہ ثابت کرنے جا رہے ہیں کہ یہ خدا کی مرضی نہیں، انسانی ہاتھوں سے سرزد جرم تھا۔"

باب-2

کاغذی ڈیم

چھ ماہ بعد۔ سول سیکرٹریٹ، اسلام آباد۔

کانفرنس روم میں چھائی خاموشی انتہائی مہنگے اور پرتعیش گرد و پیش سے مزین تھی۔ یہ وہ مخصوص سکوت تھا جو صرف ساگوان کے بھاری دروازوں کے پیچھے، موٹے قالینوں کی نرمی اور ایئر کنڈیشنر کی دھیمی سہراہٹ کے سائے میں پروان چڑھتا ہے۔ شایان ملک ایک لمبی میز کے وسط میں بیٹھا تھا۔ اس کی پسلیاں تو جڑ چکی تھیں اور اب صرف موسم بدلنے پر ہی وہاں ایک درد کی ہلکی سی لہر دوڑتی تھی، مگر اس کی آنکھوں میں جی تھکن مستقل ہو چکی تھی۔

اس کے سامنے 'نیشنل کلائمٹ ریزیلیٹنس فریم ورک' کا مسودہ رکھا ہوا تھا، جسے اس نے اب پہلے سے زیادہ مختصر کر دیا تھا؛ اس میں سے تمام علمی اور لفظی اصطلاحات کو خارج کر کے، اس کی جگہ تباہ کن طوفان سے اخذ ہونے والے تلخ اور ناقابل تردید اعداد و شمار درج کر دیے گئے تھے۔ میز کی دوسری طرف سیکرٹری اسجیڈ علی قاضی براجمان تھا؛ ایک ایسا شخص جس کا پورا کیریئر اس فنِ لطیف پر استوار تھا کہ کچھ کیے بغیر خود کو مصروف کار کیسے دکھایا جائے۔

قاضی نے اپنے سونے کے فریم والے چشمے کو درست کیا اور ایک غیر ملکی مشاورتی فرم کی تیار کردہ سو صفحات کی چمکدار رپورٹ پر اپنے قیمتی 'مونٹ بلانک' پین کو ہلکے سے تپتھپاتا۔ یہ وہ رپورٹ تھی جو حکومت نے ایک بھاری رقم کے عوض تیار کروائی تھی۔

"جذباتی باتیں ہیں، ملک صاحب۔" قاضی نے اپنے مخصوص اور روایتی تحکمانداز میں کہا۔ "آپ کا یہ مسودہ بہت جذباتی اور پر جوش ہے۔ مگر ہم پہلے ہی بنیادی ڈھانچے کی مضبوطی کے لیے بین الاقوامی فنڈنگ حاصل کرنے کے مراحل میں ہیں۔ کنکریٹ کی حفاظتی دیواریں، دریا کے پاٹ کو گہرا کرنا؛ یہ وہ مادی اثاثے ہیں جنہیں دنیا دیکھ سکتی ہے۔"

شایان نے میز پر آگے بھٹکتے ہوئے اپنی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست کیں۔ "سیکرٹری قاضی صاحب! پورے احترام کے ساتھ عرض ہے کہ آپ نظام کی اس بنیادی نااہلی پر کنکریٹ کالیپ نہیں کر سکتے۔ سوات کا یہ طوفان محض موسم کی کوئی خرابی نہیں تھا، یہ اس بے لگام اور بے رحمانہ کٹائی کا نتیجہ تھا جس نے پورے پہاڑ برہنہ کر دیے ہیں۔"

"ہمارے ہاں درختوں کی کٹائی کے خلاف انتہائی سخت قوانین موجود ہیں،" قاضی نے صفائی دیتے ہوئے فقرہ کسا۔

"وہ قوانین جنہیں ٹبر ما فیا ردی کا غنہ سمجھتا ہے، کیونکہ مقامی انتظامیہ ان کی جیب میں ہے،" شایان نے دھیمی مگر کاٹ دار آواز میں جواب دیا۔ "جب تک آپ اس ماحولیاتی تباہی کی جڑ پر وار نہیں کریں گے۔ جب تک آپ مقامی برادریوں میں اس آفت کا مقابلہ کرنے کی سکت اور متبادل روزگار پیدا نہیں کریں گے۔ آپ کی یہ کنکریٹ کی دیواریں اگلے ہی سیزن کے ریلے میں بہ جائیں گی۔ موسمیاتی بقا کا مطلب صرف انجینئرنگ نہیں، پالیسی کا نفاذ ہے۔"

قاضی نے ایک سرد آہ بھری، یہ ایک ایسے بیوروکریٹ کی بیزاری تھی جس کے آرام میں حقیقت نے غلغلہ ڈال دیا ہو۔ "حقیقت پسند نہیں، شایان۔ آپ ہم سے یہ توقع رکھ رہے ہیں کہ ہم مقامی مقتدر حلقوں اور طاقت کے ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیں۔ یہ ایک سیاسی بارود کا ڈھیر ہے۔ ہمیں ایسے منصوبے چاہیے جو قابل عمل ہوں اور جنہیں دیکھ کر ڈونز فوراً راضی ہو جائیں، کوئی جہاد نہیں کرنا ہمیں۔"

"میں آپ سے صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اس ملک کو ڈوبنے سے بچالیں،" شایان نے بے بسی سے کہا۔

"چلیں آج کی یہ میٹنگ ختم کرتے ہیں،" قاضی نے اٹھتے ہوئے اپنے سوٹ کا بٹن بند کیا اور حتمی فیصلہ سنایا۔ "ہم آپ کے ان۔۔۔ مشاہدات کو۔۔۔ اس بنیادی انفراسٹرکچر کی تجویز کے آخر میں ایک ضمیمہ (appendix) کے طور پر شامل کر دیں گے۔ اپنا خیال رکھئے گا ملک صاحب۔"

کمرہ خالی ہو گیا، مگر شایان اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ وہ اپنے اس فریم ورک کو تکتا رہا۔ ایک کاغذی ضمیمہ! اس قیامت کی ایک فٹ نوٹ، جس نے اسے موت کے منہ تک پہنچا دیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد، شایان بلو ایریا کے ایک کیفے کے اندھیرے کونے کے کیمبن میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کبھی ایسپر یسوکافی اب بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ روازے کے اوپر لگی گھنٹی بجی اور زوہیہ اس کے سامنے والے کیمبن میں آ بیٹھی۔ اس نے میز پر میٹینیا پیپر

کے دو موٹے لفافے بچ دیے۔ سوات کے اس طوفان میں اس کے ابو پر لگنے والا زخم تو اب مٹ چکا تھا، مگر اس کی جگہ اس روایتی اور چمکدار سرکین کی بنجیدگی نے لے لی تھی جو اس کا نیٹ ورک اس سے طلب کرتا تھا۔ لیکن اس کا وجود اب بھی اسی بے چین توانائی سے لبریز تھا۔ "تم ایسے دکھی ہو رہے ہو جیسے ابھی کوئی جنگ ہار کر آئے ہو،" اس نے ویٹر کو بلیک کافی کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بس وفاقی بیوروکریسی کی دیواریں ہلاتے ایک محرکہ ہارا ہے،" شایان نے اپنی کپٹیوں کو مسلتے ہوئے جواب دیا۔ "سیکرٹری قاضی اسی کنکریٹ کی دیواروں کے منصوبے پر بضد ہے۔ کوئی پالیسی اصلاحات نہیں ہوں گی، بس انفراسٹرکچر کے چمکتے دھتکے ہوں گے جن کا فیتہ کاٹ کر کچھ لوگ ایکشن میں جاسکیں۔"

زوبیہ کے چہرے پر کوئی حیرت نہیں ابھری۔ "انہیں ایکشن کے چکر کے لیے ایسے ہی نظر آنے والے منصوبے چاہیے ہوتے ہیں،" اس نے پہلے لفافے کو تھپتھپایا۔ "اور پشاور سے بھی کسی مدد کی امید مت رکھنا۔ صوبائی محکمہ جنگلات اوپر سے نیچے تک ان کے ساتھ کھڑا ہے۔ اگر صوبہ ان ٹمبر کارٹلز کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہیں جنہوں نے سوات کی ڈھلوانوں کو گنجا کیا، تو میں خود یہ قدم اٹھاؤں گی۔ میں ان کے خلاف دستاویزی شہوتوں کا ایک پورا ریکارڈ تیار کر رہی ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ دوسرے لفافے کی طرف بڑھایا۔ "مگر ماحولیات کی یہ بیٹ اس وقت میرا آدھا سر درد ہے، شایان۔ نیٹ ورک اس دوسری انویسٹی گیشن کو پوری طرح دفن کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

شایان نے ماتھے پر ہل لاتے ہوئے اس موٹی فائل کو دیکھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"وسطی پنجاب۔ لالہ موسیٰ کی کہانی،" زوبیہ نے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ڈکٹی کے راستے ہیں۔ غیر قانونی مائگریشن کے وہ خفیہ راستے جو ہماری سسکستی معیشت اور نوجوانوں کی اس بے روزگاری فوج کا فائدہ اٹھا رہے ہیں، جن کے لیے ریاست کے پاس ہنرمندانہ افرادی قوت باہر بھیجنے کا کوئی باقاعدہ فریم ورک موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اس خلا کو یہ بلیک اکاؤنٹی پُر کر رہی ہے۔ گجرات، لالہ موسیٰ اور خیبر پختونخوا کے کچھ علاقوں میں بیٹھے یہ منظم سنڈیکلیٹس ان نوجوانوں کو بحیرہ روم کے سہانے خواب بیچ کر اربوں روپے کما رہے ہیں، جو پیسہ کمانے کی آس میں اپنی جانوں پر کھیل جاتے ہیں۔"

"اس کی انسانی قیمت بہت ہولناک ہے،" شایان نے بڑبڑایا، اور ان دونوں الگ الگ بحرانوں کی سنگین سچائی میز پر پھیل گئی۔

"بالکل،" زوبیہ نے ان لفافوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "یہ دو بالکل الگ بلائیں ہیں، شایان۔ صوبائی محکمے شمال کے ٹمبر مافیا

کی پشت پناہی کرتے ہیں، اور وفاقی ایجنسیاں پنجاب کے ان انسانی اسمگلروں کے آگے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہیں۔ یہ پورا نظام فاج زدہ سا ہو گیا ہے۔"

شایان نے کیفے کی کھڑکی سے باہر مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھا۔ اس چمکتے دھلتے شہر اور اس سسکتے ہوئے ملک کے درمیان کا فاصلہ روح کو نخمی کر دینے والا تھا۔ وہ ایک ایسی وفاقی بیوروکریسی سے لڑ رہا تھا جو صرف وقتی، نمائش پسند اور سطحی حل کو حتیٰ حل سمجھتی تھی۔ "قاضی کو اعداد و شمار اور شواہد چاہئیں،" شایان نے دھیمی آواز میں کہا، اس کے ذہن میں ایک نئی حکمتِ عملی نے جنم لیا تھا۔ "وہ سمجھتا ہے کہ موسمیاتی بقا صرف سیلاب کے بعد کنکریٹ کا لپ کر دینے کا نام ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب پانی اتر جائے تو ریاست کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔"

اس نے زوبیہ کی طرف دیکھا۔ "تم ان دونوں سنڈیکیٹس کا پیچھا جاری رکھو۔ محکمہ جنگلات کے افسران کو جھنجھوڑو اور لالہ موہی کے ان ایجنٹوں کا سراغ لگاؤ۔ مگر مجھے ان کے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے کچھ ایسا لانا ہوگا جو ثابت کر سکے کہ تباہی کی بڑی وجہ انسانی افعال ہیں، جنہیں درست کیا جاسکتا ہے۔ مجھے انہیں وہ مخفی زاویے یا بلا سنڈ سپاٹ دکھانے ہوں گے جہاں یہ جھانکنے سے گریزاں ہیں۔"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" زوبیہ نے اس کے بدلے ہوئے لہجے کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔

"جنوب کی طرف،" شایان نے کہا۔ "ان خشک اور بنجر زمینوں کی طرف۔ اگر مجھے ان کے اس مصنوعی بیانیے کو مسترد کرنا ہے، تو مجھے انہیں یہ دکھانا ہوگا کہ جب آفت گھات میں ہو اور ریاست پوری طرح آنکھیں پھیر لے، تو سب سے زیادہ کمزور طبقے پر کیا گزرتی ہے۔ میں جھل گئی جا رہا ہوں۔"

باب-3

ٹکراؤ

جینل 7/24 کے نیوز روم سے باسی کافی اور برقی آلات کی دبیز مہک کے ساتھ نہ ختم ہونے والے کسی انجانے خوف کی بو آ رہی تھی۔ ڈائریکٹر نیوز کے شیشے کی دیواروں والے دفتر کے اندر کی فضا اس سے کہیں بوجھل تھی۔ زوبیہ قریشی کارپوریٹ سٹریٹجی کے سربراہ، فہد کے سامنے کھڑی تھی۔

فہد ایک ایسا شخص تھا جس کے سوٹ کی قیمت کسی دیہی اسکول کے سالانہ بجٹ سے بھی زیادہ تھی۔ اس وقت وہ فلیٹ سکریں ٹی وی پر زوبیہ کی آنے والی ڈاکومنٹری کے پرومو کے ایک رکے ہوئے فریم کی طرف اپنی تراشی ہوئی انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ "ہم اسے آن ایئر نہیں کر سکتے سرمد،" فہد نے اس شخص کی طرف مڑتے ہوئے کہا جو اس بھاری میز کے پیچھے بیٹھا تھا۔

ڈائریکٹر نیوز سرمد علی اپنی کپٹیوں کو مسل رہے تھے۔ وہ ایک تجربہ کار صحافی تھے جنہوں نے کئی حکومتوں کے ادوار دیکھ رکھے تھے، مگر کارپوریٹ کھاتوں کے یہ اعداد و شمار ان کے کیریئر کے سب سے مشکل چیلنج ثابت ہو رہے تھے۔

"میں صرف حقیقت بیان کر رہی ہوں، فہد،" زوبیہ نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا، اس کا لہجہ حد درجہ پرسکون مگر جارحانہ تھا۔ "وہ لاگٹ ٹرک (کٹی ہوئی لکڑیاں ڈھونے والے ٹرک) جنہیں ہم نے کمراٹ اور سوات میں فلم بند کیا؟ وہ لوگ جوان پہاڑوں کو مسلسل گنجا کر رہے تھے، اور جن کی وجہ سے جب درخت نہ رہے تو چٹانیں سیلاب کا حصہ بن گئیں اور پتھر یلے سیلاب سینکڑوں جانیں لے ڈوبے؟ وہ 'الضرار گروپ' کی فرضی اور کاغذی کمپنیوں (shell companies) کے نام پر رجسٹرڈ ہیں۔"

"الضرار گروپ ان ہاؤسنگ سوسائٹیز کے پچاس فیصد حصص کا مالک ہے جو اس نیٹ ورک کو اشتہارات دیتے ہیں!" فہد چلایا، اس کا چہرہ غصے سے لال ہو چکا تھا اور اس کی کپٹی پر ایک رگ ابھرائی تھی۔ "تم اس نیٹ ورک سے یہ کہہ رہی ہو کہ وہ چند درختوں کی خاطر اپنا گلا خود کاٹ لے۔"

"لوگ ڈوب کر مرے ہیں، فہد! یہ چند درختوں کا معاملہ نہیں ہے،" زوبیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا، اس کی آواز کی کاٹ برقرار تھی۔ "سوات کے پہاڑ اس لیے پیٹھے کیونکہ ایسی صفا کیمپینوں نے قانونی حد سے میلوں اوپر جا کر صنوبر کے درختوں کا صفایا کر دیا تھا۔ یہ ایک جائے وقوعہ ہے۔"

فہد نے طنز یہ ہنسی ہنستے ہوئے سرد کی طرف دیکھا۔ "یہ کسی ایکٹوسٹ کا من گھڑت افسانہ ہے۔ کہاں ہے پولیس کی رپورٹ؟ کہاں ہے ایف آئی اے (FIA) کی انویسٹی گیشن؟ اگر تم نے بغیر کسی سرکاری چارج شیٹ کے اسے آن ایئر کیا، تو یہ بزنس گروپ ہتک عزت کے دعوے میں، ہمیں عدالتوں میں گھسیٹ کر برباد کر دے گا۔ یہ ہمارے بزنس کا قتل ہوگا، سرد۔ یا اسے گم کرو بس۔"

"اور لالہ موسیٰ کی اس انویسٹی گیشن کا کیا ہوگا؟" زوبیہ نے پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہوئے چیلنج کیا۔ "وسطی پنجاب سے چلنے والے وہ انسانی سملنگ کے رنگز؟ جو ہمارے بیٹوں کو بحیرہ روم میں ڈوبنے کے لیے بھیج رہے ہیں؟ وہاں سے تو آپ کو اشتہارات کا کوئی پیسہ نہیں آ رہا۔ کیا ہم اسے بھی روک رہے ہیں؟"

"ہم ہر اس سٹوری کو روک رہے ہیں جو اس نیٹ ورک کو بغیر کسی مستند ثبوت کے اربوں روپے کے مقدمے میں پھنسا دے!" فہد نے غصے سے جواب دیا۔ اس نے اپنی آستین کے کف درست کیے، کارپوریٹ سرد مہر انداز اس کے وجود پر دوبارہ طاری ہو چکا تھا۔ "بورڈ کی مینٹنگ چار بجے ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ دونوں چنگاریاں اس سے پہلے بجھادی جائیں گی۔" وہ پلٹا اور شیشے کا بھاری دروازہ زور سے بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

دفتر کے اندر کی خاموشی سرد کی پمکدار سا گوان کی میز پر کسی مٹی کی طرح بیٹھ گئی۔ "عدالتی مقدمات کے بارے میں وہ غلط نہیں کہہ رہا، زوبیہ،" سرد نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو مسلتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"سرد صاحب! آپ نے سوات کی وہ اصل فوئج خود دیکھی ہے،" زوبیہ نے میز کے کنارے پر اپنے ہاتھ جماتے ہوئے التجا کی۔ "آپ جانتے ہیں کہ ٹمبر کاٹل کے بارے میں، میں بالکل سچی ہوں۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ گجرات اور لالہ موسیٰ کے یہ ڈنگی ایجنٹ کتنی بڑی بلیک اور نادیدہ معیشت چلا رہے ہیں۔"

"سچا ہونا ہمارے شفاف کی تنخواہیں ادا نہیں کرتا، اور نہ ہی اس سے ہمارے براڈ کاسٹ لائسنس کا تحفظ ہوتا ہے،" سرد نے اپنی چڑے کی کرسی پر پیچھے گرتے ہوئے جواب دیا۔ "میری بات غور سے سنو۔ میں تمہاری صحافت کا گلا نہیں گھونٹ رہا۔ مگر میں ان

کہانیوں کو تب تک کے لیے روک رہا ہوں جب تک یہ ناقابلِ تردید نہ ہو جائیں۔ مجھے تمام ضروری شواہد چاہئیں۔ جب تک تمہارے پاس ایسے دستاویزات نہ ہوں جنہیں یہ مافیا زبانی کورٹ میں جھٹلا نہ سکیں، میری سکرین پر ان کا نام نہیں آئے گا۔ آپ سمجھ رہی ہو؟"

زوہبیہ نے اپنے جبرے بھینچ لیے۔ یہ ادارتی احتیاط کے لہادے میں لپٹا ہوا ایک سنسر شپ آرڈر تھا۔ وہ ملک کی دوسب سے بڑی اور ہولناک سچائیوں سامنے لانے کیلئے کام کر رہی تھی، مگر اس سے زبان کھولنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

"ٹھیک ہے،" زوہبیہ نے کہا، لفظ اس کے حلق میں کسی زہر کی طرح کڑوے محسوس ہوئے۔ "مگر جمعرات کے پرائم ٹائم کا سلاٹ میرا ہی رہے گا۔ میں اس کیلئے کچھ اور بے حد اہم لے کر آرہی ہوں۔"

سرمد نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "اب کیا کرنے جا رہی ہو خیر سے؟"

"موسمیاتی تبدیلیوں کے متاثرین کے حالات،" اس نے کہا، اس کا ذہن پہلے ہی ایک نئے جغرافیے کی طرف اڑان بھر چکا تھا۔ "ان موسمیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے اندرونی نقل مکانی (Internal climate displacement)۔ وہ کسان جو سندھ کے ساحلوں پر سمندر کی جارحیت کی وجہ سے اپنی زمینیں کھو کر کراچی کی کچی آبادیوں میں آ پھنستے ہیں۔ میں کسی کارپوریٹ کا ٹیل یا ٹمبر مافیا کا نام نہیں لے رہی۔ بس اس مرتے ہوئے ساحل کی وہ برہنہ اور انسانی سچائی دکھاؤں گی۔"

سرمد نے دھیرے سے سر ہلایا، اس کے چہرے پر ایک اداس اطمینان ابھر آیا۔ یہ ایک ایسی اثر انگیز صحافت تھی جو کسی کارپوریٹ مقدمے کو دعوت نہیں دے سکتی تھی۔

"اندرونی ہجرت پر یہ پیکج کرو۔ مگر اپنا دھیان رکھنا، زوہبیہ۔ جن لوگوں کو تم نے سوات اور پنجاب میں خاموشی سے چھپڑا ہے، وہ صرف عدالتی نوٹس نہیں بھیجتے؛ وہ پیغام بھیجتے ہیں۔"

جھل مگسی، بلوچستان

اگر شمال پانی میں ڈوب چکا تھا، تو جنوب راہ کی طرح تپ رہا تھا۔ شیان ملک کرائے کی ٹویوٹا بائی لکس سے باہر نکلا، اس کے بوٹ اس زمین پر پڑے جو اس حد تک تپ کر پک چکی تھی کہ کسی ٹوٹی ہوئی سیرامک کی طرح دکھ رہی تھی۔ وہ پیش ایک جسمانی

حملے کی مانند تھی، جو نیچے زمین سے اہل رہی تھی اور اوپر ایک ایسے آسمان سے برس رہی تھی جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ یہاں شور مچانے کے لیے کوئی دریا نہیں تھا۔ یہاں صرف ایک طویل اور بھیاں تک خشک سالی کا مطلق اور ہولناک سکوت تھا۔

اس نے اپنے چشمے کو درست کیا اور اڑتی ہوئی مٹی کے آگے اپنے منظر کو ناک تک چڑھا لیا۔ وہ ایک دور دراز یونین کونسل کے گورنمنٹ گرلز ہائی سکول کے باہر کھڑا تھا۔

"ملک صاحب، رکھیں،" اس کے مقامی گائیڈ، رسول نے تنبیہ کی۔ "پہلے مجھے ان سے بات کرنے دیں۔" مگر شایان پہلے ہی صحن کی طرف بڑھ چکا تھا، یہاں اسے سب کا گہرا اعتماد حاصل تھا۔ ایک مرتے ہوئے نیم کے درخت کے دھیمے سائے تلے ایک شدید بحث چل رہی تھی۔ ایک نوجوان خاتون ڈسٹرکٹ ریلیف کوآرڈینیٹر کے سامنے کھڑی تھی، اس نے روایتی بلوچی چادر اوڑھ رکھی تھی اور اس کا انداز انتہائی غیر لچکدار تھا۔ یہ ہانی تھی۔ شایان اسے نام سے جانتا تھا؛ وہ صوبے میں خواتین کی صحت اور حقوق کے لیے لڑی جانے والی ایک بے باک آواز تھی۔ اس کے قدموں میں کارٹن کے تین کھلے ہوئے بکس پڑے تھے۔ حکومت کے روایتی خشک سالی کے امدادی پیکیج۔

"چالو، کوئنگ آئل اور پینا ڈول،" ہانی کہہ رہی تھی، اس کی اردو بالکل صاف اور کڑک تھی، وہ اپنے جوتے کی ٹھوک سے بکس کو ہلا رہی تھی۔ "یہ مذاق ہے؟ کیا یہ کوئی تماشہ ہے؟ میں نے تین ماہ پہلے اس یونین کونسل کی ضرورت کی فہرست جمع کروائی تھی، ظفر صاحب۔ کہاں ہیں خواتین اور لڑکیوں کی حفظانِ صحت کی اشیاء (Menstrual hygiene supplies)؟"

کوآرڈینیٹر نے خفت سے پہلو بدلا اور اپنی گردن سے پسینہ پونچھا۔ "بی بی، مجبوری تھی۔ ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ ریلیف بجٹ کاٹ دیا گیا ہے۔ کوئٹہ سے سپلائی چین میں رکاوٹیں ہیں۔ ہمیں صرف زندہ رہنے کے لیے ضروری اشیاء کو اولیت دینی تھی۔"

"آپ لگتا ہے کہ ایک حیاتیاتی حقیقت کو دیکھنا اور سمجھنا زندہ رہنے کا مسئلہ نہیں ہے؟" ہانی کی آواز اونچی تو نہیں ہوئی مگر اس کی دھارتیز ہو گئی۔ "یہ عورتوں کی صحت کا معاملہ ہے، کوئی عیاشی نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں کہ کیسے خشک سالی نے یہاں کے مویشی مار دیے، مقامی معیشت زمین پر آگری ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس نے مارکیٹ کا کیا حشر کیا؟ بازار میں سیڑی پیڈز کا ایک پیکٹ اب اس قیمت پر ملتا ہے جو ایک خاندان دو دن میں کماتا ہے۔ اگر دکاندار اسے رکھنے کی زحمت کرے بھی تو۔ خریدنے کی سکت صفر ہے۔"

کوآرڈینیٹر نے اپنے کلپ بورڈ کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے کتراتے ہوئے بولا، "یہ کوئی معیاری امدادی سامان نہیں ہے، بی بی۔"

"اور یہی تو سب سے بڑی نااہلی ہے!" ہانی نے فقرہ کسا۔ "کسی آفت میں آپ پیٹ اور بخار کا تو منصوبہ بناتے ہیں، مگر خواتین کی بنیادی ضرورت کو پورے منظر نامے سے ہی غائب کر دیتے ہیں۔ اور یہ صرف ان کیپوں کا حال نہیں ہے۔ اس سکول کو دیکھیں۔" اس نے اپنے پیچھے اس خستہ حال عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"اگر کسی لڑکی کو کلاس کے دوران یہ مسئلہ درپیش ہو، تو یہاں کوئی ایمرجنسی شاک موجود نہیں ہے۔ سکول کے پاس اس سامان کیلئے کوئی بجٹ نہیں، اور اس کا خاندان اسے خریدنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس اس سے نمٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ، وہ سکول چھوڑ دیتی ہے۔ اور چند دن غائب رہنے کے بعد، وہ کبھی واپس نہیں آتی۔"

وہ کوآرڈینیٹر کے مزید قریب ہوئی۔ "ان بنیادی مصنوعات تک رسائی کے بغیر—خواہ وہ کسی امدادی کٹ میں ہوں، سکول کی ڈسپنری میں ہوں یا کسی مقامی دکان پر—آپ ان لڑکیوں سے ان کی نقل و حرکت اور ان کا وقار چھین لیتے ہیں۔ ان کمسوں کو واپس لے جائیں جب تک کہ ان میں اس پوری آبادی کی ضروریات کی عکاسی نہ ہو۔"

شایان چند منٹ کے فاصلے پر کھڑا مبہوت ہو کر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکی کا رٹن کے ان تین کمسوں کے ذریعے قومی ڈیزاسٹر ریسپانس کے پورے کاغذی ڈھانچے کے پر نچے اڑا رہی تھی۔ وہ اس اسی بلاسٹڈ سپاٹ کو عیاں کر رہی تھی جو ہر اس پالیسی میں موجود تھا جو اس نے اب تک ڈرافٹ کی تھی: ان مصنوعات کو لازمی امدادی اور ترقیاتی انفراسٹرکچر کا حصہ نہ ماننے کی نااہلی۔

کوآرڈینیٹر نے اگلی بار اس کی درستگی کا ایک بار اہوا وعدہ کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا اپنی جیب کی طرف لپکا۔ ہانی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا، جیسے ہی غصے کا ابال مدہم ہوا اس کے کندھے ہلکے سے جھک گئے۔ وہ مڑی اور اس کی نظر پہلی بار شایان پر پڑی۔ اس کی سیاہ آنکھوں نے اس کے جوتوں، اس کے نوٹ پیڈ اور اس کے ایک باہری شخص ہونے کے واضح تاثر کا جائزہ لیا۔

"اگر میرا اندازہ درست ہے" ہانی نے شدید تھکن سے چور آواز میں کہا۔ "اسلام آباد سے آئے ہوئے ایک اور کنسلنٹ۔ آپ یہاں ہماری موسمیاتی بقا پر ایک اور رپورٹ لکھنے آئے ہیں؟"

شایان نے اپنا چشمہ اتارا۔ "میں پالیسیاں لکھتا ہوں، رپورٹیں نہیں۔ میرا نام شایان ملک ہے۔"

"پالیسیاں،" ہانی نے اس لفظ کو دہرایا جیسے اس کا ذائقہ کڑوا ہو۔ "کیا آپ کی پالیسیوں کو معلوم ہے کہ موسمیاتی تبدیلی کا بھی ایک صنفی پہلو ہوتا ہے، ملک صاحب؟ یا وہ صرف ضائع ہوئی فصلوں کو گنتی ہیں؟"

"پانچ منٹ پہلے تک، وہ صرف فصلوں کو ہی گنتی تھیں،" شایان نے اس سچائی کا اعتراف کیا جس نے ہانی کو بھی تھوڑا حیران کر دیا۔ وہ نیم کے درخت کے سائے تلے آ گیا۔ "دارالحکومت میں جن مردوں کے ساتھ میں کام کرتا ہوں، وہ سمجھتے ہیں کہ آفت کا مقابلہ صرف گندم کی بور یوں سے ہوتا ہے۔ میں یہاں اس لیے آیا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے، مگر مجھے یہ دیکھنا تھا کہ یہ سپلائی چین ان لوگوں کے لیے کہاں دم توڑتی ہے جن کی طرف یہ بیوروکریسی دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔"

ہانی نے کچھ سوچنے کے انداز میں اس کا جائزہ لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ مخاطب کی آنکھوں میں وہ روایتی 'سب جاننے' کی رعونت نہیں ہے۔

"یہ 'لازمی' کی تعریف پر ہی دم توڑ جاتی ہے، شایان صاحب،" ہانی نے نرمی سے کہا۔ "اگر آپ اسے اپنی پالیسی کا حصہ بنانا چاہتے ہو، تو میں آپ کو دکھاؤں گی کہ اس رسائی کا نہ ہونا اصل میں کیسا دکھتا اور محسوس ہوتا ہے۔ مگر اگر آپ یہاں صرف افسوس کرنے آئے ہیں، تو آپ واپس اپنی ہائی لکس میں بیٹھ سکتے ہیں۔"

باب-4

سفید زمین

بدین، ساحلِ سندھ۔

یہاں کی زمین جھل گسی کے پتے ہوئے میدانوں کی طرح نژک نہیں گئی تھی، بلکہ یہ منجمد ہو کر چمک رہی تھی۔ زوہیہ قریشی بدین کے ساحلی پٹی پر واقع اس کھیت کے کنارے کھڑی تھی جو کبھی دھان کی ہریالی سے ابلہا تا تھا۔ مگر اب یہ منظر ایسا دکھتا تھا جیسے اس پر کسی زہریلی برف کی موٹی تہہ بچھی ہو۔ مٹی کے اوپر نمک کی ایک سفید، سخت پاڑی جم چکی تھی۔ اس نے اپنا کیمرو اٹھایا اور دھندلے، بو جھل افق کے پس منظر میں ببول کے ایک سوکھے، مکے جیسے ڈھانچے کو فریم میں بند کیا۔

بحیرہ عرب، جو کبھی ایک دور کا ہمسایہ تھا، اب ایک جارح مکان مالک بن چکا تھا جو ہر سال مزید اندر کی جانب گھستا چلا آ رہا تھا، میٹھے پانی کے زیر زمین ذخائر کو زہر آلود کر رہا تھا اور مٹی کا دم گھونٹ رہا تھا۔

"دس سال پہلے، یہاں چار سو ہریالی ہی ہریالی ہوا کرتی تھی،" عقب سے ایک لرزتی ہوئی آواز آئی۔ زوہیہ نے کیمرو نیچے کیا اور مڑ کر دیکھا۔ چاچا قاسم، جن کے چہرے کی گہری جھریاں دھوپ اور نمک کے ساتھ گزری عمر کا نقشہ پیش کر رہی تھیں، لکڑی کے ایک لاٹھی کے سہارے کھڑے تھے۔ ان کے کندھے پر ایک پرانی سندھی اجرک تھی اور ان کی آنکھیں سفید موتیا کی وجہ سے دھندلا گئی تھیں۔

"اور اب؟" قاسم نے اپنی لاٹھی زمین پر ماری۔ اس سے ایک سخت اور کھولی آواز پیدا ہوئی۔ "زمین بخر ہو گئی ہے۔ اب ہم یہاں صرف نمک اگاتے ہیں۔ سمندر میٹھا پانی کھا گیا۔ جھیلوں میں مچھلیاں مر گئیں، اور پھر مٹی میں فصلیں دم توڑ گئیں۔"

زوبیہ نے اپنے کیمرو میں، علی کو اشارہ کیا جو ان کی جیب کے پاس تھوڑا پیچھے کھڑا تھا، کہ وہ ریکارڈنگ جاری رکھے۔ وہ اس عمر رسیدہ شخص کے مزید قریب آئی۔ 'سرمہ نے مجھے ایک جذباتی اور انسانی کہانی ڈھونڈنے کو کہا تھا، 'زوبیہ نے تنہی سے سوچا۔ لاہور میں بیٹھے اس کے پاس کوآنسو چاہیے تھے، کسی کارپوریٹ مافیافروجرم نہیں۔ مگر زوبیہ جانتی تھی کہ یہ آنسو ایک چوری شدہ مستقبل کا صرف ایک بائی پروڈکٹ (حاصل) ہیں۔

"سب لوگ کہاں ہیں، چاچا؟" زوبیہ نے مٹی اور اینٹوں سے بنے ان گھروں کی ویران بستی کے گرد دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔ "مجھے یہاں صرف بوڑھے نظر آ رہے ہیں۔ جوان لڑکے کہاں گئے؟"

قاسم کے سینے سے ایک تلخ اور گہری کھانسی ابھری۔ "سمندر نے زمین نگلی، اور شہر نے ہمارے بیٹے۔ یہاں ایک جوان لڑکے کے لیے بچائی کیا ہے؟ وہ نہ پھل پکڑ سکتا ہے، نہ کھیتی کر سکتا ہے۔ وہ کراچی چلا جاتا ہے۔ وہ مجھ کو لونی یا اورنگی ٹاؤن چلا جاتا ہے۔ وہ وہاں اس گندگی میں دیہاڑی پر کام کرتا ہے، اور اتنے روپے بھیج دیتا ہے جس سے ہم ایک وقت کی روٹی چلا سکیں۔"

زوبیہ کو محسوس ہوا جیسے اس الجھی ہوئی پہیلی کا ایک اور ٹکڑا اپنی صحیح جگہ پر بیٹھ گیا ہو۔ "اور کیا وہ کراچی میں ہی رک جاتے ہیں؟"

قاسم نے اس مردنی افق کی طرف دیکھا، لاٹھی پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی۔ "مگر شہر ایک ظالم آقا ہے۔ وہ ان کی روح کچل دیتا ہے۔ وہ مستقبل کی تلاش میں جاتے ہیں، مگر کچی آبادیوں کے ٹھیکیدار وہاں ان کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ انہیں تعمیراتی جگہوں پر امیروں کے لیے ٹاور بنانے اور اپنی پیٹھ تڑوانے کے چند ٹکے دیتے ہیں، جبکہ وہ خود گٹرلوں کے کنارے سوتے ہیں۔"

انہوں نے دوبارہ زوبیہ کی طرف دیکھا، ان کی سفید آنکھیں اچانک غصے سے چمکیں۔ "میرا سب سے چھوٹا، رحمت۔ اس نے مجھ کو لونی میں ٹین کی چھت والے ایک کمرے کا بندوبست کرنے کے لیے اپنی ماں کے سونے کے کنگن تک بیچ دیے تھے۔ وہ کپڑا رنگنے والی ایک غیر قانونی اور غیر محفوظ فیملری میں روزانہ چودہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ کیمیکل کی وجہ سے اس کے پھیپھڑے جواب دے رہے ہیں، اور وہ مقامی واٹر مافیا کا جتنا قرضدار ہے، اتنا کمابھی نہیں پاتا۔ وہ اس گاؤں سے ایک غیور کسان بن کر نکلا تھا، اور شہر نے اسے ایک غلام بنادیا۔"

زوبیہ کی سانسیں جیسے تھم گئیں۔ یہ تھی اصل کہانی۔ وہ خاموش اور ان کہی داستان۔ موسمیاتی تبدیلیوں نے دیہی معیشت کو تباہ کر دیا۔ بے دخل ہونے والے نوجوانوں نے شہر کی کچی آبادیوں کا رخ کیا۔ وسائل، زمین اور ریاستی تحفظ سے محروم ہو کر، وہ کراچی

کی بے لگام صنعتی مشینوں اور لینڈ مافیا کا بہترین اور مجبور لقمہ بن گئے۔ یہ استحصال کا ایک ایسا مکمل چکر تھا، جسے پہلا دھکا ماحولیاتی تباہی نے دیا تھا۔

"اس علاقے سے کتنے خاندان جا چکے ہیں، چاچا؟" زوبیہ نے اپنی جیکٹ سے ایک چھوٹی نوٹ بک نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ان مرے ہوئے درختوں کو گن لو، بیٹا،" قاسم نے تلخی سے تھوکا۔ "نمک نے جتنے درخت مارے ہیں، اتنے ہی خاندانوں نے ان کچی آبادیوں کا رخ کرنے کیلئے یہاں سے اپنا بستر گول کیا ہے۔"

ایک گھنٹے بعد، زوبیہ جیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی، اور گاڑی کا ایئر کنڈیشنر ساحلی نمی کے آگے ہانپ رہا تھا۔ جب وہ ہائی وے کی طرف واپس جانے والی نمک زدہ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک پر بچکولے کھا رہے تھے، اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور اپنے نوٹس ٹائپ کرنا شروع کیے اور اس خام ڈیٹا کو ایک ترتیب دی۔

سرمد کو ایک انسانی ہمدردی کی کہانی چاہیے تھی؟ وہ اسے سرکاری نااہلی کی ایک ایسی فرد جرم دینے جا رہی تھی جسے وہ جھٹلا نہیں سکے گا۔ وہ بدین کے اس مرتے ہوئے ساحل سے لے کر کراچی کے صنعتی زونز کی اس دم گھونٹی، زہریلی غربت تک کا ایک مکمل ڈیوگرافک نقشہ تیار کر رہی تھی۔ اس کی جیب میں موجود فون واہریٹ ہوا۔ یہ ایک نامعلوم نمبر سے محفوظ ٹیکسٹ منبج تھا۔ "واپسی کا سفر شروع کریں، مس فریٹی۔ یہاں اس مری ہوئی مٹی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کسی پر الزام دھرنے کی کوشش بے نتیجہ ہو گی، اس سے باز رہنا آپ کیلئے اچھا ہوگا۔"

زوبیہ اس چمکتی ہوئی سکریں کو تکتی رہی۔ اس کے ہونٹوں کے کونے پر ایک سرکش مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ مقامی وڈیرے اور ضلعی حکام جو ساحلی بحالی کے فنڈز خاموشی سے ہضم کر رہے تھے، ان کے ویران اضلاع میں کیمروں کے گھومنے سے واضح طور پر گھبرا چکے تھے۔ اس نے اس کا سکریں ثناٹ لے لیا۔ ان دھمکیوں کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک بار پھر کسی نازک مہم پر اپنا پیہر رکھ چکی ہے۔

اس نے وہ نمبر ڈائل کیا جس پر اس نے سید و شریف کے ہسپتال کے بعد سے کبھی فون نہیں کیا تھا۔ دو گھنٹیاں بچیں اور دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔ "شایان،" زوبیہ نے کھڑکی سے باہر دوڑتے ہوئے اس ناگفتہ منظر نامے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ اصل کہانی مل گئی ہے۔ سمندر کھیتوں کو تباہ کر رہا ہے، انہیں شہروں کی طرف دھکیل رہا ہے، اور شہری کچی آبادیاں انہیں زندہ نگل رہی ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا، خاموش آبادیاتی زوال ہے۔"

"میں کونسل میں ہوں،" شایان کی آواز اس کمزور سنگٹل والے کنکشن سے گونجی۔ "یہاں کے پالیسی ساز بھی اتنے ہی لائق ہیں، زوبیہ۔ وہ صرف علامات کا علاج کرتے ہیں، بیماری کا نہیں۔"

"تو پھر ہم انہیں دیکھنے پر مجبور کریں گے،" زوبیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم پہاڑوں میں پالیسی کو سنبھالو۔ میں کراچی جا رہی ہوں۔ مجھے مجھڑ کا لونی کے اندر گھس کر اس پورے زوال کو کیمرے میں قید کرنا ہے۔"

باب-5

سرخ فیتہ اور سبز چائے کوئٹہ، بلوچستان۔

کوئٹہ کی ہوا جھل مگسی کی تپتی ہوئی زمین کے بالکل برعکس، ایک تیکھا اور بے رحم تضاد لیے ہوئے تھی۔ اس ہوا میں بلندی کی ایک تیز، ہلکی سی خنکی اور بھنے ہوئے چلغوزوں کی دھیمی سی خوشبو سی تھی۔ صوبائی ڈائریکٹوریٹ آف ہیلتھ کے اندر، ڈاکٹر طاہرہ کمال بلوچ کا دفتر پورے ماحول میں ایک الگ ہی جزیرہ دکھاتا تھا۔ ایک ایسی عمارت میں جہاں اکھڑتا ہوا رنگ اور بوسیدہ، دھول سے اٹی فائلوں کے ڈھیر اس کی پہچان تھے، ان کا یہ کمرہ درجہ منظم اور پرسکون حد تک گرم تھا۔

کوئٹہ میں ایک چھوٹا گیس ہیٹر دھیمی آواز میں چل رہا تھا، اور محفل کے بھاری پردوں نے زرغون روڈ کی ٹریفک کے شور کو باہر ہی روک رکھا تھا۔ شایان ملک چمڑے کے ایک قدرے پرانے صوفے پر بیٹھا تھا، اور اس کے ہاتھوں میں الائچی والی سبز چائے کا ایک گرم کپ تھا۔ اس کے سامنے ڈاکٹر طاہرہ براجمان تھیں۔ ان کی نظروں میں ایک سرجن کی وہ مخصوص تیکھی اور غیر متزلزل توجہ تھی جو مریض کے بولنے سے پہلے ہی بیماری کی تشخیص کر لیتی ہے۔ ان کے ساتھ شاہانہ تبسم بیٹھی تھی، جس کی شوخ کڑھائی والی شال ان کے سنجیدہ اور تجربہ یاتی انداز گفتگو کا ایک خوبصورت تضاد پیش کر رہی تھی۔ شاہانہ، ڈاکٹر طاہرہ کی طبی مہارت کے لیے ایک سماجی انجن کا درجہ رکھتی تھی۔

"صرف چاول اور پیناڈول۔" شایان نے خاموشی کو توڑتے ہوئے چائے کا کپ میز پر رکھا۔ "انہوں نے صرف چاول اور پیناڈول بھیجے ہیں۔ پانچ سال کی شدید خشک سالی، جھل مگسی کی مقامی معیشت کا مکمل جنازہ نکل جانا، اور ان کے امدادی سامان کے کارٹنوں میں عورتوں کی مخصوص صحت اور صفائی کا کوئی ایک نشان تک موجود نہیں تھا۔ میں نے خود دیکھا کہ بانی نامی ایک مقامی ٹیچر نے اس پرنٹسٹرکٹ کو آرڈینر کے کیسے لے لئے۔"

ڈاکٹر طاہرہ نے کرسی پر پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے اپنی ٹھوڑی کو ہاتھ پر ٹکایا۔ ان کے چہرے پر کوئی حیرت نہیں تھی، بلکہ ایک عمیق تنہکن تھی۔ "ہانی بالکل سچی ہے۔ طبی حقائق اور ہمارے پاس موجود ڈیٹا اس کی پوری طرح تصدیق کرتے ہیں، شایان۔ جب سپلائی چین ٹوٹ جائے اور خریدنے کی سکت ختم ہو جائے، تو خواتین میں پوشیدہ امراض اور انفیکشنز (urogenital infections) کا ایک طوفان آجاتا ہے۔ خواتین روایتی شرم و حیا اور سماجی خوف کی وجہ سے گندے چیتھڑے استعمال کرتی ہیں، انہیں اسی آلودہ اور کھڑے پانی میں دھوتی ہیں، اور پھر نم اور اندھیری جگہوں پر چھپا دیتی ہیں۔"

"یہ ایک خاموش تباہی ہے،" شاہانہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے آگے جھک کر کہا۔ "اور صحت کا یہ بحران اس المیہ کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ سماجی ہے۔ ان مصنوعات اور محفوظ واش رومز تک رسائی نہ ہونے کی وجہ سے، ان خشک سالی زدہ علاقوں کی لڑکیاں سکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یہ ان کی تعلیم کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتا ہے۔ مگر آپ یہ بات بجٹ کی ڈورتھامے ان مردانہ افسران کو سمجھانے کی کوشش کر کے دیکھ لیں جن کے ذہن ان موضوعات کو سمجھنے سے عاری ہیں۔"

"اور اسی لیے، اب ہمیں انہیں یہ بات سمجھانا بند کرنی ہوگی،" شایان نے مسکراتے ہوئے بڑے بڑے نپے تلے انداز میں کہا۔ اس کے اندر کا پالیسی ساز اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ "پالیسی کی جنگ کسی بند دروازے پر سر مار کر نہیں جیتی جاتی۔ آپ کو کوئی دوسرا دروازہ ڈھونڈنا ہوتا ہے۔"

اس نے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور ایک نیا صفحہ کھولتے ہوئے لکھا۔ "میں نے ایک مربوط فریم ورک کا مسودہ تیار کیا ہے۔ صحت، ماحولیات، اور تعلیم۔ اگر ہم عورتوں کی صحت کے مسئلہ کو محض 'خواتین کا طبی مسئلہ' بنا کر پیش کریں گے، تو یہ صوبائی محکمہ صحت کے بجٹ تلے دب کر رہ جائے گا۔ جو پہلے ہی دیوالیہ ہو چکا ہے۔ مگر اگر ہم اسے 'تعلیمی بقا اور ماحولیاتی مطابقت کا تناظر' (Educational Retention and Climate Adaptation metric) بنا کر پیش کریں تو۔۔۔"

ڈاکٹر طاہرہ کی آنکھیں اچانک ایک گہری اور تجربہ کار سمجھداری سے چمک اٹھیں۔ "تو آپ اس کا پورا مالی بوجھ دوسرے محکمے پر منتقل کر رہے ہو۔ اور اس کا پورا زادہ بدل رہے ہو۔"

"بالکل!" شاہانہ نے کہا، اور ان کے چہرے پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ صرف ہمارا معرکہ نہیں ہے شایان،" شاہانہ تبسم نے چائے کا گم میز پر رکھتے ہوئے بڑے مان سے کہا۔ "بلوچستان کی اس مٹی نے ہمیشہ کٹھن وقت میں مخلص اور باوقار انسان پیدا کیے ہیں۔ جھل گئی کسی کے ان تپتے ہوئے صحرائوں سے لے کر کوئٹہ کے ان سردایوانوں تک، اگر آج ہم یہاں بیٹھ کر اس

پالیسی کی بات کر رہے ہیں تو ہمیں پوری امید ہے کہ محکمہ آبادی کے سابق سیکریٹری عبداللہ خان جیسی کھرے اور نیک نام شخصیت کی رہنمائی شامل ہمیں میسر ہوگی۔ ہمارے پاس شہزادہ ذوالفقار اور سلیم شاہد جیسے بے باک اور نڈر صحافیوں کا قلم موجود ہے جنہوں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا، اور عرفان اعوان، ڈاکٹر سعید اللہ اور ڈاکٹر فاروق اعظم جیسے مخلص اور جیونین نظریہ دانوں کی فکری حمایت بھی حاصل ہو سکتی ہے، جنہوں نے ہر سرکاری اور سماجی رکاوٹ کے آگے ہمارے لیے ڈھال کا کام کیا۔ جب ایسے درو دل رکھنے والے لوگ اس مہم کے لنگر بنے کھڑے ہوں گے، ہم بہتری کی امید رکھ سکتے ہیں۔ "اور میں اچھے سے جانتی ہوں کہ اس وقت کس کو اس ان آپٹکس (optics) کی زیادہ تلاش ہے، سائرہ حمید۔"

شایان نے اپنے نوٹس سے نظریں اٹھائیں۔ "صوبائی وزیرِ تعلیم۔؟"

"وہ تجربہ کار مگر اس شعبے میں نئی ہیں، پر عزم ہیں، اور اپنے کیریئر کے لیے کسی ایسے بڑے تاریخی منصوبے کی تلاش میں ہیں جو ان کی پہچان بن سکے،" شاہانہ نے کافی کی میز پر اپنی انگلی تھپتھپاتے ہوئے سمجھایا۔ "سائرہ صاحبہ صوبے میں لڑکیوں کی تعلیم میں ایک انقلاب لانے والی وزیر کے طور پر جانی جانا چاہتی ہیں۔ مگر وہ اس وقت اینٹ اور گارے کے وہی روایتی سکول بنانے کے چکر میں پھنسی ہیں جن سے لڑکیاں ویسے بھی غائب ہو رہی ہیں۔ انہیں ایک بڑی، ترقی پسند اور واضح جیت چاہیے۔ کوئی ایسی چیز جسے وہ بین الاقوامی ڈونرز کے سامنے فخر سے پیش کر سکیں۔"

"اگر ہم اس عورتوں کے انفراسٹرکچر اور سپلائی چین کے پروگرام کو موسمیاتی سختیوں کے دوران لڑکیوں کو سکولوں میں برقرار رکھنے کا کلیدی ذریعہ بنا کر پیش کریں،" ڈاکٹر طاہرہ نے سوچتے ہوئے کہا، ان کا ذہن اب بڑی تیزی سے تانے بانے بن رہا تھا، "تو یہ اس روایتی سماجی جھجک (taboo) کو بھی بائی پاس کر جائے گا۔ یہ پھر ماہواری کا مسئلہ نہیں رہے گا، بلکہ 'صحت عامہ اور تعلیمی تسلسل' کا معاملہ بن جائے گا۔"

شایان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہم اس سپلائی چین کو براہِ راست محکمہ تعلیم کے بجٹ کا حصہ بنا دیں گے۔ سکول ان بنیادی مصنوعات کی تقسیم کے مرکزی مراکز بن جائیں گے، جس سے ڈسٹرینجمنٹ کی روایتی سستی اور رکاوٹیں خود بخود دور کی جاسکیں گی۔"

"سائرہ صاحبہ کو اس کا بین الاقوامی تاثر بہت پسند آئے گا،" شاہانہ نے کہا۔ "مگر وہ سیاسی طور پر بہت پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی ہیں۔ اگر قدامت پسند حلقوں کی طرف سے کوئی ہلکا سا ردِ عمل بھی آیا۔ اگر انہوں نے سکولوں میں 'نامناسب'

موضوعات لانے کا الزام لگایا۔ تو وہ ایک سینڈ میں اس منصوبے سے ہاتھ کھینچ لیں گی۔"

"تو پھر ہم ان کے دفتر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی اس منصوبے کو ٹھوس اور ناقابلِ تردید بنادیں گے،" شایان نے کہا۔ اس نے ان دونوں خواتین کی طرف دیکھا، اسے ان کی مہارت اور خلوص کی پختہ سچائی پر پورا بھروسہ تھا۔ یہی وہ اتحاد تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ سوات کے پہاڑ اور جھل گسی کی تپتی زمین تو صرف بیماری کی تشخیص تھے؛ کوئٹہ کا یہ کمر اس کا علاج تھا۔

"شہانہ، آپ ان پسماندہ اور خشک سالی زدہ اضلاع میں لڑکیوں کے سکول چھوڑنے کی شرح کا ایک مکمل نقشہ تیار کرو۔ ڈاکٹر طاہرہ، آپ مجھے ان ہی اضلاع میں عورتوں کی ہانچیں کا خیال نہ ہونے کی وجہ سے پھیلنے والے انفیکشنز کا طبی ڈیٹا مہیا کر سکیں تو بہت اچھا ہو جائے گا۔ میں اس پالیسی کا وہ پورا ڈھانچہ تیار کروں گا جو ان سب کو ملا کر ایک ایسا پائلٹ پروجیکٹ بنا دے جسے وزیرِ تعلیم مسترد نہیں کرنا چاہئیں گی۔"

شایان نے سبز چائے کا کپ اٹھایا، اس کی حرارت اب اس کے ہاتھوں میں اتر رہی تھی۔ اس نے شہانہ کی طرف دیکھا اور سوال کیا "ہم کتنی جلدی وزیرِ موصوفہ سے ملاقات کر سکتے ہیں؟"

پالیسی کا معرکہ

وزیرِ تعلیم سائرہ حمید کا دفتر مرغوب کر دینے کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا، مگر وہ خود حد درجہ جدید اور متحرک ذہن کی مالک تھیں۔ وہ اپنی شے کی بڑی میز کے پیچھے بیٹھی تھیں، ایک ہاتھ میں ڈسکریٹ ٹیبلٹ اور دوسرے میں پین تھا، اور وہ بغیر کسی تاثر کے اس پورے منصوبے کو سن رہی تھیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، اور اس حقیقت سے بخوبی واقف تھیں کہ ان کی سیاسی بقا کا دار و مدار اس گہرے مردانہ مقتدرہ والے صوبے میں کچھ ایسے نتائج دینے پر ہے جو عملی طور پر نظر آئیں۔

شایان نے 'کلائمٹ ایڈاپٹیو ایجوکیشنل ریٹینشن انیشیٹیو' کے خدو خال کا بیان ختم کرتے ہوئے دو صفحات کا خلاصہ ان کی میز پر رکھ دیا۔ "ہم نے جھل گسی کے خشک سالی زدہ علاقوں میں جو کچھ دیکھا، وہ ہماری روزمرہ کی غفلت کا ایک انتہائی ہولناک پہلو ہے،" شایان نے اپنی آواز کو نپا تار رکھتے ہوئے واضح کیا۔

"ایز جنسی تو صرف اس بنیادی نااہلی کو عیاں کرتی ہے جو پہلے سے موجود ہے۔ اصل بحران یہ ہے کہ اس ملک میں عورتوں کی اس

بنیادی ضرورت کو ایک عیاشی یا پر تعیش سامان (luxury good) سمجھا جاتا ہے۔ یہ تمام خواتین اور لڑکیوں کے لیے روزمرہ کی دستیابی، پہنچ اور سست کا ایک بہت بڑا معر ان ہے۔ "ڈاکٹر طاہرہ نے آگے جھکتے ہوئے طبی ڈیٹا کی شیٹ میز پر آگے بڑھائی۔

"جب کسی خاندان کی قوت خرید کم ہوتی ہے۔ خواہ وہ فصلوں کی بربادی کی وجہ سے ہو یا عام مہنگائی کی وجہ سے۔ تو گھر بیوسودا سلف کی فہرست میں سے جس سب سے پہلی چیز پر کٹ لگتا ہے، وہ یہ سینیٹری پیڈز ہی ہیں۔ مارکیٹ میں ان کی قیمتیں عام ورکنگ کلاس کی پہنچ سے باہر ہو چکی ہیں۔ اس کا نتیجہ پورے صوبے میں شدید پوشیدہ امراض کی شکل میں نکل رہا ہے۔" اور یہ ایک تعلیمی زوال ہے،" شاہانہ نے بات کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

"جن لڑکیوں کے پاس ان مصنوعات تک رسائی نہیں ہوتی، وہ گھر بیٹھ جاتی ہیں۔ وہ مہینے میں ایک ہفتہ غائب رہتی ہیں، پڑھائی میں پیچھے رہ جاتی ہیں، اور بالآخر سکول ہی چھوڑ دیتی ہیں۔ آپ صوبے میں لڑکیوں کی تعلیم میں انقلاب لانا چاہتی ہیں، وزیر صاحبہ؟ تو آپ کو صرف بہتر نصابی کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو سکول آنے کی اس حیاتیاتی لاجسٹکس کو درست کرنا ہوگا۔"

سائرہ حمید نے اپنے بین کوششے کی میز پر ہلکے سے تھپتھپایا۔ "آئیے اس معاملے کی سیاسی حقیقت پر بالکل سیدھی بات کرتے ہیں۔ آپ ایک دورخی حکمت عملی تجویز کر رہے ہیں۔"

"بالکل،" شایان نے کہا۔ "پہلا رخ (Track A) فوری صوبائی مداخلت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی وزارت سکولوں کو ان مصنوعات کی تقسیم کے بنیادی مرکز کے طور پر منظور کرے۔ ہم ڈیزاسٹر مینجمنٹ کی سستی کو بائی پاس کر دیں گے۔ ہم خاتون ہیڈ ماسٹریز کو اس انوینٹری کا انچارج بنائیں گے، اور اسے 'ہائین اینڈ ریٹینشن کٹس' (صحت اور تعلیمی تسلسل کی کٹ) کا نام دیں گے تاکہ قدامت پسند حلقوں کی تنقید کا راستہ ہی بند ہو جائے۔"

"یہ میں کر سکتی ہوں، سائرہ صاحبہ نے ڈیٹا پر نظریں جماتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "سکولوں کا انفراسٹرکچر میرے کنٹرول میں ہے۔ یہ مجھے ایک ٹھوس، ترقی پسند پائلٹ پروجیکٹ دیتا ہے۔ مگر دوسرا رخ (Track B) کیا ہے؟"

"دوسرا رخ اصل علاج ہے،" شایان نے کہا، اس کا لہجہ اب پہلے سے زیادہ جاندار تھا۔ "دوسرا رخ یہ ہے کہ ہمیں ان مصنوعات پر عائد ٹیکسوں کے خاتمے (MHH Tax Reform) کے لیے ایک بہت بڑی مشترکہ مہم چلانی ہوگی۔ ہمیں ان سینیٹری مصنوعات کی تیاری میں استعمال ہونے والے خام مال پر عائد تمام امپورٹ ڈیوٹیز اور جی ایس ٹی کا خاتمہ کروانا ہوگا، اور فائل

پروڈکٹ کو زیرو ریٹنگ (rate-zero) پر لانا ہوگا۔ ہمیں پورے ملک میں اس کی بنیادی قیمت کو نیچے لے کر آنا ہوگا۔" ساڑہ حمید نے کرسی پر پیچھے ٹیک لگائی، ان کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ "آپ جانتے ہوشیاریاں کہ وفاقی ٹیکس کوڈ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسلام آباد میں بیٹھی وزارت مالیات ان ٹیکسز کا فیصلہ کرتی ہے۔"

"ہم جانتے ہیں،" شاہانہ نے کہا۔ "مگر صوبے سے اٹھنے والی مؤثر آواز ہم سب کے پاس موجود ہے۔ ایک صوبائی وزیر کے طور پر آپ کا ایک سیاسی وزن ہے۔ اگر بلوچستان اسمبلی صحت اور تعلیم کی بنیاد پر اس ٹیکس چھوٹ کا مطالبہ کرنے والی ایک باقاعدہ قرارداد منظور کرتی ہے، اور یہاں کی سیاسی قیادت قومی میڈیا پر اسے اوزر شپ دیتی ہے، تو آپ ہمیں اسلام آباد سے بات کے لیے وہ سیاسی ڈھال فراہم کر دیں گی جس کی ہمیں ضرورت ہے۔"

ساڑہ حمید نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ وہ اس میں موجود سیاسی خطرے کو بھی دیکھ رہی تھیں، مگر اس سے کہیں زیادہ، انہیں اس کے پیچھے موجود ایک ناقابل تردید دلیل نظر آ رہی تھی۔ وہ ایک ایسی پالیسی کی معمار بن سکتی تھیں جو صرف سکول کی دیواریں نہیں بناتی، بلکہ لڑکیوں کو ان دیواروں کے اندر محفوظ بھی رکھتی ہے۔

"اسلام آباد میں بیٹھے مالیات کے وہ باپ آپ سے آخری دم تک لڑیں گے،" ساڑہ صاحبہ نے تنبیہ کی۔ "وہ اتنی آسانی سے اپنے آمدنی کے ذرائع نہیں چھوڑتے۔ وہ دعویٰ کریں گے کہ قومی خزانہ اس ٹیکس چھوٹ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔"

"قومی خزانہ ایک بیمار، معذور خواتین کی ورک فورس اور تباہ حال ہیلتھ کیئر سسٹم کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتا،" ڈاکٹر طاہرہ نے تیکھا جواب دیا۔

ساڑہ حمید نے ہاتھ اٹھا کر ان کی بات تسلیم کی۔ "ٹھیک ہے۔ میں کل ہی صوبے کے تین سب سے زیادہ متاثرہ اضلاع میں سکولوں کے ذریعے اس سامان کی تقسیم کے پائلٹ پروجیکٹ کی منظوری دے دوں گی۔ اور شاہانہ، آپ صوبائی اسمبلی کے لیے اس ٹیکس اصلاحات کی قرارداد کا مسودہ تیار کرنا شروع کریں۔ اس مہم میں، میں آپ کا ساتھ دینی کو تیار ہوں، مگر آپ کو دوسری سیاسی جماعتوں کو بھی اعتماد میں لینا ہوگا۔"

انہوں نے شاہانہ کی طرف دیکھا۔ "مگر میں اسلام آباد کو اس پر دستخط کرنے کے لیے مجبور نہیں کر سکتی۔ آپ کوئی ایسا دباؤ (leverage) ڈھونڈنا ہوگا جہاں وفاقی حکومت کے لیے اس ٹیکس اصلاحات کو 'ناں' کہنا ایک بدترین پبلک ریلیشنز

یا ڈراؤنا خواب بن جائے۔"

"اسلام آباد کو میں دیکھتا ہوں،" شایان نے کہا۔ "دارالحکومت کو مجھ پر چھوڑ دیں۔"

سیکریٹریٹ سے نکل کر کونستہ کی اس خنک دوپہر میں قدم رکھتے ہی، شایانہ نے ایک طویل اور گہرا سانس لیا۔ "انہوں نے ہاں کہہ دی۔ سکول ہمارے پاس ہیں۔ ہمارے پاس اس ٹیکس اصلاحات کی حمایت کرنے والی ایک صوبائی وزیر موجود ہیں اور رہی بات دوسری سیاسی جماعتوں کی تو۔۔۔ رحمت صالح بلوچ سے زیادہ کون ہماری ترجمانی کر سکتا ہے۔"

ڈاکٹر طاہرہ نے شایان کی طرف دیکھا۔ "مگر وزیر تعلیم درست کہہ رہی ہیں۔ ایک صوبائی قرارداد محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جب تک وفاقی وزارتِ مالیات اسے تسلیم کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ہم ان سے بات کیسے منوائیں گے؟"

شایان نے اپنی جیب کی طرف بڑھتے ہوئے فون نکالا اور زویہ کا نمبر ڈائل کیا۔ فون سیدھا وائس میل پر چلا گیا۔ شایان کے ماتھے پر بل آئے، ایک انجانی سی بے چینی اس کے وجود میں لہرائی۔ "زویہ،" اس نے ریکارڈنگ پر کہا۔ "کونستہ کا دروازہ کھل چکا ہے۔ ٹیکس مہم آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر ہمیں اسلام آباد کے پالیسی سازوں پر تھوڑا برسنانے کی ضرورت ہے۔ ہم اس حوالے سے کیا کر سکتے ہیں؟ مجھے فوراً کال بیک کرو۔"

باب-6

بندشیریا نیں

صوبائی سیکریٹریٹ کی عمارت سے نکل کر کوئٹہ کی اس خنک دوپہر میں قدم رکھتے ہی، شایان کے وجود میں امید اور اطمینان کی ایک نایاب، دھیمی سی لہر اٹھی۔ "وہ واقعی یہ قدم اٹھانے جا رہی ہیں،" شاہانہ نے ہوا کے تیز جھونکوں کے آگے اپنی کڑھائی والی شال کو مزید مضبوطی سے لپیٹتے ہوئے کہا۔ "وزیر تعلیم اس ٹیکس قرارداد کی بھرپور حمایت کیلئے تیار ہیں، آپ مسودہ تیار کرو"

شایان نے اس بات سے اتفاق کیا، اس کا ذہن پہلے ہی اگلے اقدامات کی ترتیب بنا رہا تھا۔ "اور ہماری اس فیلڈ میں 'سچائی' ایک انتہائی نایاب اور بیش قیمت چیز ہے۔ وزیر تعلیم اس بات کو اچھے سے سمجھتی ہیں کہ پالیسی کا مطلب صرف سکرین پر چمکنا یا نمائش کرنا نہیں؛ بلکہ یہ زندہ رہنے اور بقا کی میکا کی لاجسٹکس کا نام ہے اور رحمت صالح بلوچ جیسی عوامی شخصیت بھی اس ضمن میں بے حد اہم نام ہے۔"

ڈاکٹر طاہرہ ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں، ان کا انداز فکر مند تھا۔ "بلوچستان کا اس قرارداد کو منظور کرنا اپنی جگہ شایان، مگر اسلام آباد میں بیٹھی وزارتِ مالیات کو اس ٹیکس چھوٹ پر اصل دستخط کرنے ہیں۔ وہ لوگ بالکل الگ تھلگ، اپنے شیشے کے گلوں میں بیٹھے ہیں۔ انہیں یہاں نیچے بستوں میں کسی پر کیا یقینی ہے، سے کوئی سروکار نہیں۔"

"یہ ان کی کوئی ذاتی دشمنی یا عناد نہیں ہے،" شایان نے فٹ پاتھ پر ایک چائے والے کوراستہ دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ تو بس ایک گہری، نظام میں رچی ہوئی بے حسی ہے۔ اسلام آباد ایک الگ ہی دنیا (بلبلہ) ہے۔ وہاں کے باوجود صرف مانیٹر پر پھیلی ہوئی ایکسل شیٹس دیکھتے ہیں، جیتے جاگتے انسان نہیں۔ جب تک کوئی چیز ان کے جپٹ کے کھاتوں پر اثر انداز نہ ہو، ان

کے لیے اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔"

"تو پھر کیوں نہ ہم سول سوسائٹی اور این جی اوز (NGOs) کے نیٹ ورکس کو متحرک کریں؟" شاہانہ نے مشورہ دیا۔ "بڑے بڑے اداروں کو ساتھ ملا کر وفاقی سطح پر ایک بھرپور لابی مہم شروع کی جائے۔"

شایان کے حلق سے ایک مختصر اور تلخ ہنسی نکلی۔ "این جی اوز اس معاملے کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گی، شاہانہ۔ میں نے اپنی زندگی کے کئی سال ان ہی حلقوں میں گزارے ہیں۔ وہ کسی مخصوص علاقے میں 'آگاہی کے ورکشاپس' کروانے کے لیے ڈورز کو پوپولز لکھنے میں تو ماہر ہیں، مگر جہاں بات وفاقی ٹیکس کوڈ کو چیلنج کرنے کی آجائے؟ ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ ان میں فیصلہ سازوں کے سامنے کھڑے ہونے یا اسے جھنجھوڑنے کا حوصلہ ہی نہیں ہے جو ان کے کام کرنے کے لائسنس کی منظوری دیتی ہے۔ اس وفاقی معرکے میں ہم بالکل تنہا ہیں۔"

وہ ان کی ہائی ٹیکس گاڑی کے پاس آ کر کا، اور اس کی نظریں دو رجسٹرڈ کے پہاڑوں کی تیکھی اور آڑی ترچھی چوٹیوں پر جم گئیں۔ "ہم فیصلہ سازوں سے جنگ نہیں لڑ سکتے، ہمیں پالیسی ایڈووکیسی کرنی ہے، وہی ہم کریں گے اور بھرپور طریقے سے" شایان نے پر عزم انداز میں کہا۔ "ہمارے پاس وہ طاقت یا دباؤ موجود نہیں ہے۔ وزارت مالیات کو یہ محسوس ہونا چاہیے کہ ان مصنوعات پر سے ٹیکس کا خاتمہ ان کی اپنی کوئی اخلاقی فتح ہے، نہ کہ ان کی ہار۔ ہمیں ایک نرم مگر سفارشی لابی اور اثر و رسوخ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک ایسے قومی بیانیے کی ضرورت ہے جو انہیں دفاعی پوزیشن پر لائے بغیر، بڑی نرمی مگر مضبوطی سے اس درست قدم کو اٹھانے پر مجبور کر دے۔ اور اس کام کے لیے، مجھے میڈیا کی طاقت چاہیے۔"

اس نے اپنا فون نکالا اور محمد انور کا نمبر گھمایا؛ ترقیاتی شعبے کا ایک ایسا منجھا ہوا اور تجربہ کار کھلاڑی جس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ شہری اور موسمیاتی بے حسی کے خلاف لڑتے ہوئے گزارا تھا۔ "انور صاحب! یہ این جی اوز وفاقی ٹیکس کوڈ کے اس جنجال کو ہاتھ لگانے سے بھی ڈرتی ہیں،" شایان نے فون اٹھتے ہی اپنے دل کا غبار نکالا۔

"حکمرانی اور نظام کبھی اجازت مانگنے سے نہیں بدلتے، شایان،" انور صاحب کی بھاری، پختہ اور غیر متزلزل آواز دوسری طرف سے گونجی۔ "اگر یہ سیکلر تمہارا ساتھ نہیں دے رہا، تو انہیں بائی پاس کرو۔ کوئی ایسا راستہ ڈھونڈو جو وزارت مالیات کو ایسا دکھائے کہ اگر وہ اس پر دستخط کر دیں تو ہیرو بن جائیں گے، اور اگر دیر کی تو مجرم ٹھہریں گے۔ میڈیا کو متحرک کرو۔"

ادھر لاہور میں، زوبیہ اپنے کمپیوٹر مانیٹر کو گھور رہی تھی، اور اس کی انگلی کی بورڈ پر 'ڈیلیٹ' (Delete) کی کلید پر جمی تھی۔ اندرونی نقل مکانی پر اس کا تیار کردہ خصوصی پیکیج 'دی سالٹ مائگریشن' (The Salt Migration) — آن ایئر چاچکا تھا اور اسے ہر حلقے سے بے پناہ پذیرائی مل رہی تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے مرتے ہوئے ساحلوں کے الیے اور کراچی کی کچی آبادیوں کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ کی تلخ سچائی کو دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا تھا۔

مگر اس کے اس پورے پروجیکٹ کا دوسرا حصہ، وہ انویسٹی گیشن جس میں اس نے اپنے خون پسینے کی کمائی اور اپنی روح پھونک دی تھی، اس وقت ایک مقفل اور انکریپٹڈ فولڈر کے اندر قید پڑی تھی، 'دی گیٹ کیپر' (The Gatekeeper) کے نام سے اس سٹوری کا گلاڈ ایٹر یکٹریو سز مد نے آج صبح ہی گھونٹ دیا تھا۔

"تم نے کراچی کی ان کچی آبادیوں میں پناہ لینے والے مجبور لڑکوں کے حالات کو جس طرح دکھایا ہے، وہ واقعی ایک شاندار کام ہے، زوبیہ،" سرمد نے اپنی اس بھاری سا گوان کی میز کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے کہا تھا، ان کے چہرے پر ایک مخلصانہ افسوس تھا مگر ان کا فیصلہ ٹل تھا۔ "مگر یہ دوسری انویسٹی گیشن؟ گجرات اور لالہ مولیٰ کے بیلٹ سے چلنے والے یہ 'ڈکنی' ایجنٹس؟ یہ سب کچھ واٹس ایپ کے مبہم لاگز اور فرضی بینک اکاؤنٹ کے گرد گھومتا ہے۔"

سرمد نے بات جاری رکھی "ہمارا قانونی شعبہ ایک ایسے بین الاقوامی سمگلنگ رنگ کے خلاف کہانی نشر کرنے کی اجازت کبھی نہیں دے گا جس کے پیچھے اتنے بڑے سیاسی مہرے اور پشت پناہ کھڑے ہوں، اور ہمارے پاس کوئی مستند مالیاتی ثبوت بھی نہ ہو۔ ہمارا چینل بند کروادیں گے وہ۔ ہتک عزت کے دعووں کے ذریعے وہ اس پورے نیٹ ورک کا تالا لگوا دیں گے۔"

زوبیہ کرسی سے پیچھے ہٹی اور شدید جھنجھلاہٹ میں اپنے بالوں میں ہاتھ بھیرا۔ اس کے پاس سچائی موجود تھی۔ وہ اچھے سے دیکھ پا رہی تھی کہ اس پورے نظام کا ہر تانا بانا آپس میں کیسے جڑا ہوا ہے — کس طرح ریاست جنوب کے ان موسمیاتی مہاجرین کو نظر انداز کرتی ہے، اور اسی وقت وسطی پنجاب کے پسماندہ اور بے روزگار نوجوانوں کا شکار کرنے والے ان انسانی سمگلروں کے سامنے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ مگر اس کا اپنا منہ اسی ادارے نے بند کر دیا تھا، جس کا کام اسے زبان دینا تھا۔

میز پر رکھے اس کے فون نے سراہٹ پیدا کی۔ اس نے جھپٹ کر اسے اٹھایا۔ "شایان! خدا کے لیے کہنا کہ تمہارے پاس کوئی اچھی خبر ہے، کیونکہ میں اس وقت اپنے لیپ ٹاپ کو کھڑکی سے باہر پھینکنے کے لیے بالکل تیار بیٹھی ہوں۔"

"مجھے عورتوں کی حفظانِ صحت کی پالیسی کے لیے صوبائی حکومت کی پوری حمایت مل چکی ہے،" دوسری طرف سے شایان کی

پرسکون اور جاندار آواز آئی۔ "وزیرِ تعلیم ٹیکس اصلاحات کی مہم کی سپورٹ کے لیے تیار ہیں اور اپوزیشن لیڈر بھی۔ مگر وفاقی حکمت عملی کے محاذ پر میں ایک دیوار سے ٹکرا گیا ہوں۔ یہ این جی اوز سطح پر ایڈووکیسی کا کام نہیں۔ مجھے ایک غیر جارحانہ مگر اثر انگیز بیانیہ تیار کرنے کے لیے تمہاری مدد چاہیے۔ ہمیں قومی پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا پر اس پورے معاملے کو اس طرح فریم کرنا ہوگا کہ وفاقی وزارتِ مالیات خود کو کسی کٹھنرے میں پانے کے بجائے، ہمدردی اور اخلاقی بنیاد پر اس قدم کو اٹھانے پر مجبور پائے۔"

زوبیہ کے حلق سے ایک کھوکھلی اور تلخ ہنسی ابھری۔ "غلط دروازے پر دستک دی ہے، شایان۔ تم نے غلط صحافی کو فون کر لیا ہے۔ میں خود اپنے نیٹ ورک کو اس بات پر راضی نہیں کر پا رہی کہ وہ بحیرہ روم میں ڈوبنے والے ہمارے بیٹوں کی کہانی سن کرین پر دکھائیں، صرف اس لیے کہ کہیں کارپوریٹ توازن اور ان کے اشتہارات کا پیسہ خراب نہ ہو جائے۔"

لائن پر ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ شایان کا تجزیاتی ذہن اس نئے نقطہ کا رستہ تلاش کر رہا تھا۔ "انہوں نے تمہارے اس سخت اور شرمسار کر دینے انکشاف (exposé) کو روکا ہے نا،" شایان نے بالآخر اپنا پتا بدلتے ہوئے کہا۔ "تو پھر ہم میدانِ جنگ ہی بدل دیتے ہیں۔ مجھے وزارتِ مالیات کو گھیرنے کے لیے قومی میڈیا کا دباؤ چاہیے؛ اور تمہیں اپنے نیٹ ورک کو لالہ موی کی یہ کہانی دکھانے پر مجبور کرنے کے لیے ایک مستند ثبوت اور دباؤ چاہیے۔ ہم دونوں اس وقت ایک ہی نظام کی بے حس کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی معلومات اور توانائیاں ایک جگہ جمع کر لیں، تو شاید ہمیں ان دونوں دیواروں کو بائی پاس کرنے کا کوئی چور راستہ مل جائے۔"

زوبیہ نے اپنی سکریں پر موجود اس لاکڈ فولڈر کو دیکھا۔ وہ نیوز روم اچانک اسے بہت چھوٹا اور دم گھونٹ دینے والا محسوس ہوا۔ "میں فون پر یہ بات نہیں کر سکتی، شایان۔ نیٹ ورک کا آئی ٹی (IT) شعبہ میری ہر ایڈنگ پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔"

"پھر وہاں سے نکلو۔ لاہور چھوڑ دو ابھی،" شایان نے حتمی لہجے میں کہا۔ "میں آج رات ہی کی فلائٹ سے واپس آ رہا ہوں۔ کل مجھے اسلام آباد میں ملو۔ ہم ساتھ بیٹھیں گے، ان تمام نیٹ ورکس کا ایک پورا نقشہ سامنے رکھیں گے، اور یہ رستہ نکالیں گے کہ تمہارے کارپوریٹ سنسور اور میری بیوروکریسی کی اس سینٹ کی دیوار کو ایک ساتھ کیسے پاش پاش کرنا ہے۔"

"کل ملتے ہیں،" زوبیہ نے حامی بھری، اس کی جھنجھلاہٹ کے پیچھے اب ایک نئی، پر جوش توانائی جاگ چکی تھی۔ "میری پسندیدہ کافی تیار رکھنا۔"

باب-7

ٹک ٹک کرتی خطرے کی گھڑیاں ایف سکس مرکز، اسلام آباد۔

وہ سپر مارکیٹ کی دوسری منزل پر واقع ایک پرسکون اور الگ تھلگ سے کیفے میں ملے۔ یہ ایف سیون کے ان نئے اور چمکدار ٹھکانوں کی طرح نہیں تھا جو صرف سوشل میڈیا کی نمائش اور تصویروں کے لیے ڈیزائن کیے جاتے ہیں؛ اس جگہ کے فرش پر پرانے لکڑی کے تختے جڑے تھے، روشنی دھیمی اور گرم تھی، اور اس کے گوشے ایسے لوگوں کے لیے موزوں تھے جنہیں کچھ ایسی گفتگو کرنی ہو جو باقی شہر کے کانوں تک نہ پہنچے۔ فرش سے لے کر چھت تک پھیلی شیشے کی بڑی کھڑکیوں سے باہر، شام ڈھلنے کے ساتھ ہی مارگلہ کی پہاڑیاں گہرے اودے رنگ کے سحر میں ڈوب رہی تھیں۔

شایان نے بلیک کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور میز کی دوسری طرف بیٹھی زویہ کی طرف دیکھا، جو کافی کے مگ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے، محض اپنے صحافتی جذبے کے سہارے جھکن سے لڑ رہی تھی۔ "بلوچستان کے حالات کیسے رہے؟" اس نے پوچھا۔

شایان نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "یار بہت کچھ اچھا بھی ہے، کچھ مخلص، کر دکھانے والے لوگ بھی ہیں مگر۔۔۔۔۔۔ یار عجیب تماشا ہے۔ میں نے اسی سیکٹر کے ایک شخص کے بارے میں سنا جو کبھی مطلق اور انتہائی غربت کی دلدل میں پھنسا تھا، اور اس کی زندگی کا گزارہ صرف خیرات پر تھا۔ مگر جب بالآخر اس کے قدم جم گئے اور اسے ایک بڑا عہدہ مل گیا، تو اس کی پوری حکمت عملی پالیسی سازی کے بجائے صرف پبلک ریلیشنز (PR) اور نمائش بن کر رہ گئی۔ اب اس کا عملہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ وہ بیوروکریٹس، وزراء، محکمہ جاتی سربراہوں اور ڈونرز کی خوشنودی کے لیے مہنگے، درآمد شدہ تحائف کے ٹوکے سپلائی کرتا پھرتا ہے۔ اور تم یقین کرو گی؟ اشرافیہ کو آرام دہ رکھنے کی محض اس ایک 'مہارت' کی بدولت وہ خود تو بے پناہ امیر ہو چکا

ہے، جبکہ زمینی سطح پر عوام اور اس کے کارکن اب بھی اسی طرح سسک رہے ہیں۔"

زوبیہ نے مگ کے اوپر سے شایان کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں مزید سنجیدگی بس گئی۔ "یہی تو ایک سنگین مسئلہ ہے، شایان۔ یہ ایک گہرا دھوکہ اور مٹی سے غداری ہے۔ یہاں ایک شخص کو موقع ملتا ہے اور وہ فوراً ہی اسی نظام کا معمار بن جاتا ہے جس نے کبھی اسے بھوکا رکھا تھا۔ اور ہمارے ان ریگولیز کا حال؟ خدا کے لیے، چند مخصوص اور بیش قیمت گفٹ باسکٹس کے عوض وہ اپنی پوری اتھارٹی اور ضمیر بیچ دیتے ہیں۔۔۔ یہ بات عکاسی ہے کہ ہمارے یہ ادارے کس طرح چل رہے ہیں۔"

شایان نے دھیرے سے سر ہلایا۔ "بالکل سچ۔ کسی ایسے ایماندار اور با اصول بیوروکریٹ کا ملنا جو واقعی قانون کی لکیر پر کھڑا ہے، اب ایک نایاب بات ہے۔ باقی سب تو جھوٹی موٹی مراعات اور نوازشوں کے عوض خرید لیے جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی اچھی نیت پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کا محاسبہ کرنا ہوگا۔"

وہ میز پر مزید آگے جھکا۔ "وزیر تعلیم اور اپوزیشن کے رہنما رحمت صالح بلوچستان سے اس ٹیکس اصلاحات کی قرارداد کو پاس کروانے کے لیے پوری طرح تیار ہیں،" شایان نے کیفے کے دھیمے شور کے اوپر اپنی آواز کو متوازن رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر وفاقی وزارتِ مالیات کو ان امپورٹ ڈیوٹیز اور جی ایس ٹی کو ختم کرنے پر مجبور کرنے کے لیے، مجھے ایک قومی بیانیے کے دباؤ کی ضرورت ہے۔ ہمارے صوبائی دوست کوئٹہ میں تو آواز اٹھا سکتے ہیں، مگر مجھے اسلام آباد میں مسلسل پرائم ٹائم پراس معاملے کی معاشی دلیل پر با مقصد گفتگو کی ضرورت ہے زہن سازی اور دباؤ کیلئے۔"

زوبیہ اپنی ایک انگلی مگ کے کنارے پر گھمائے جا رہی تھی۔ "میرا میٹ ورک اس معاملے پر بھی مجھے اس پر باقاعدہ رپورٹنگ کی اجازت کبھی نہیں دے گا، شایان۔ سرمد کا ماننا ہے کہ ٹیکس کوڈز اور عورتوں کی صحت کے یہ موضوعات ریٹنگ کا جنازہ نکال دیتے ہیں۔" اس نے سر اٹھایا، اس کی آنکھوں میں ایک تیکھی اور حربہ کار چمک تھی۔ "مگر اس کے لیے میرا خود سکرین پر آنا ضروری نہیں ہے۔ تم مجھے ان تمام صوبوں کا جمع شدہ ڈیٹا بھیج دو۔ مگر صرف نمبرز کا فی نہیں ہوں گے؛ ٹیلی ویژن کو چہرے چاہیے ہوتے ہیں۔ مجھے اپنی اس ٹیم کے رابطہ دو جو زمین پر اس ایجنڈے کو لے کر لڑ رہی ہے۔"

شایان نے ایک ابرو اٹھایا۔ "ڈاکٹر طاہرہ اور شاہانہ؟"

"ہاں، وہ سب،" زوبیہ نے کہا۔ "مجھے وہ مقامی پیچیدگی لڑکی بھی چاہیے۔ وہ ٹیچر جس نے امدادی کوآرڈینیٹر کو لاکا رہا تھا۔ مجھے طبی سچائی کے لیے ڈاکٹر طاہرہ چاہیے، سیاسی وزن کے لیے وزیر تعلیم اور رحمت صاحب، اور وہ تمام ترقی پسند سیاستدان، جن کا تم

نے ذکر کیا تھا۔ میں یہ پورا ڈوزیز (دستاویز) تین بڑے مارنگ شوز کے پروڈیوسرز تک پہنچا دوں گی اور کوئٹہ کی تمہاری اس ٹیم کے خصوصی انٹرویوز لائن اپ کر دوں گی۔ بدھ تک، قومی میڈیا کے پاس ایک انسانی چہرہ، ماہر طبی رائے اور ایک صوبائی وزیر موجود ہوں گے، جولا نیوٹیلی ویژن پروفاقی وزیر مالیات کو باور کر رہے ہوں گے۔ ان کے پاس اس ٹیکس اصلاحات کے سوال سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔"

شایان نے ایک گہرا سانس لیا، جسے وہ نہ جانے کب سے روکے ہوئے تھا۔ "یعنی میڈیا کا ایک منظم چھاپہ! تمہارا بے حد شکریہ۔ یہی وہ کڑی ہے جس کی مجھے تلاش تھی۔"

"اسے ہوا ہی سمجھو،" زوبیہ نے کرسی پر پیچھے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "مگر اس وقت میں صرف اتنی ہی توانائی تمہیں دے سکتی ہوں۔ میں خود اس وقت دو مختلف محاذوں پر جنگ لڑ رہی ہوں، اور میرا نیٹ ورک میرے ہاتھ باندھنے میں جتا ہے۔"

"غیر قانونی مائگریشن کی کہانی والے معاملے میں،؟ شایان نے پوچھا "ہاں وہ بھی، لالہ موسیٰ والا معاملہ،" زوبیہ نے اپنے جڑے بھینپتے ہوئے تصدیق کی۔ "میں وسطی پنجاب جا رہی ہوں۔ ریاست ان نوجوانوں کے لیے قانونی اور باقاعدہ راستے بنانے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہ ڈکی ایجنٹس انہیں موت کی مشینوں میں جھونک کر اربوں روپے کماتا رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی بلیک اکاؤنٹی ہے، اور میں اسے بے نقاب کر کے رہوں گی۔"

وہ رکی، اس کے چہرے کے تاثرات گہرے اور سنجیدہ ہو گئے۔ "مگر جس کہانی کو لائیو کرنے سے میں اندر سے کانپ رہی ہوں، وہ خیبر پختونخوا کا ٹبر مافیا ہے۔ شایان، میں جغرافیائی ڈیٹا کا جائزہ لے رہی ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ درختوں کی کٹائی سے صرف پانی کا سیلاب آتا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اس سے پتھروں کا طوفان آتا ہے، پہاڑوں کا سیلاب۔ پورا پہاڑ ہی ریلے میں بہہ جاتا ہے۔"

شایان نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ سائنسی زبان میں اگرچہ یہ لمبے کا بہاؤ (debris flow) تھا، مگر مقامی لوگ اسے اس کی اسی بے رحم اور ہر نہ سچائی سے جانتے تھے۔

"ان صدیوں پرانے صنوبر کے درختوں کی جڑیں ہی وہ واحد لنگر ہیں جو ان چٹانوں اور مٹی کو پہاڑ کی ڈھلوانوں پر جکڑے رکھتی ہیں،" زوبیہ نے اپنے ہاتھوں کی جنبش سے اس پورے عمل کی ہولناکی کو واضح کرتے ہوئے سمجھایا۔ "جب یہ ٹبر کا رٹل زان چوٹیوں کو گنجا کر دیتے ہیں، تو وہ لنگر اکھڑ جاتا ہے۔ اگلی بار جب شدید بارشیں ہوں گی، تو وادیوں میں صرف پانی نہیں اترے گا،

بلکہ پورا پہاڑ ٹوٹ کر نیچے آگرے گا۔ اگر ہم نے ان کارٹلز کو سامنے نہ لائے اور صوبائی محکمہ جنگلات کو ابھی مداخلت پر مجبور نہ کیا، تو اگلی آفت پورے کے پورے شہروں کو زندہ دفن کر دے گی۔"

شایان نے اپنی کافی کی طرف دیکھا۔ زوبیہ کی یہ تنبیہ اس کے وجود پر کسی پرانے اور سرد خوف کی طرح برسی تھی۔ ایک ایسا خوف جو شمال کی چوٹیوں کی طرف دیکھتے ہی ہمیشہ اس کے دل کو جکڑ لیتا تھا۔

"ڈھلوانوں کے بیٹھ جانے کا تمہارا یہ خوف بالکل بجایا ہے،" شایان نے دھیمی آواز میں کہا۔ "کیونکہ اس کا محرک صرف بارش نہیں ہے۔ میں خود اس وقت 'عشقِ آبا' جھیل' کی ساخت اور اس کی جڑی رپوٹوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔"

زوبیہ اچانک رکی اور شایان کے چہرے کو بغور پڑھتے ہوئے پوچھا۔ "شمال کی وہ جھیل؟ جو پہاڑی تودہ گرنے سے بنی تھی؟"

"بالکل،" شایان نے آگے جھکتے ہوئے کہا، اس کے اندر کا پالیسی ساز اب ایک ایسے شخص میں تبدیل ہو چکا تھا جو ایک نکل نکرتے ہم کو دیکھ رہا ہو۔ "وہ کوئی گلیشیر کی جھیل نہیں ہے، وہ پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے جسے مٹی، پتھروں اور پہاڑی بلے کے ایک انتہائی کمزور اور عارضی بندنے روک رکھا ہے۔ اور وہاں کے مقامی حکام اس جگہ کو ایک مستقل تفریحی گاہ سمجھ کر بیٹھے ہیں۔ وہ لینڈ مافیا کو اس پانی کے بالکل اوپر، ان ہی کمزور اور خطرناک ڈھلوانوں پر کنکریٹ کے بھاری، کثیر المنزل لہ ہول بنانے کی اجازت دے رہے ہیں، جو بالکل اس کے بہاؤ کے رستے (spillway paths) میں واقع ہیں۔" اس نے اپنی آنکھیں موند لیں، اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ صاف عیاں تھی۔

"تم کنکریٹ کے اس بھاری وزن اور ان ہی ڈھلوانوں پر ہونے والی درختوں کی کٹائی کو ایک جگہ جمع کر کے دیکھو۔ جب اگلی کوئی شدید اور غیر معمولی شدید بارش ہوگی، تو یہ ڈھلوان بیٹھ جائے گی۔ پتھروں اور بلے کا ایک پورا طوفان جھیل میں جا گرے گا، جس سے پانی کی ایک عظیم لہر ابھرے گی۔ ایک ایسا سونامی جو اس عارضی مٹی کے بند کو اڑا کر رکھ دے گا۔ جب ایسا ہوگا، تو وہ پورا پانی اور ان ہولوں کا ٹوٹا ہوا کنکریٹ کسی توپ کے گولوں کی طرح نیچے وادی میں برسے گا۔" شایان کی آواز مزید دھیمی ہو گئی۔

"اس جھیل کے بالکل نیچے واقع وہ وادی۔۔۔ ایک موت کا کنواں ہے۔ خصوصاً اس کی مرکزی بستی۔۔۔ حیدر پور۔"

زوبیہ نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ شایان ملک ہمیشہ قومی اعداد و شمار اور میکرو پالیسیوں کی بات کرتا تھا۔ وہ کبھی کسی ایک گاؤں پر اس وقت تک توجہ مرکوز نہیں کرتا تھا جب تک کہ معاملہ ذاتی نہ ہو۔ "تم حیدر پور میں کسی کو جانتے ہو۔؟"

شایان نے کھڑکی سے باہر اس گہرے ہوتے اندھیرے کی طرف دیکھا۔ "پاریسہ،" اس نے نرمی سے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"ایک ڈاکٹر،" شایان نے جواب دیا، اس کے لہجے میں ایک گہرا احترام اتر آیا۔ "وہ اس پوری وادی کی واحد لڑکی تھی جس نے میڈیکل کی ڈگری حاصل کی۔ وہ چاہتی تو کسی بڑے شہر کے کسی مہنگے پرائیویٹ کلینک میں پیٹھکتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے کسی میٹروپولیٹن شہر یا بیرون ملک جاسکتی تھی۔ مگر وہ نہیں گئی۔ وہ واپس حیدر پور لوٹ گئی۔ اس نے وہاں ایک کمیونٹی کلینک بنایا۔ وہ اپنے لوگوں کی خدمت کر رہی ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہاں کوئی اور نہیں آئے گا۔ مگر وہ نہیں جانتی، وہ سب کو بچا رہی ہے مگر وقت آیا تو خود اسے بچانے کو بھی کسی نے نہیں آنا۔"

اس نے اپنی نظریں دوبارہ زوبیہ پر جمائیں۔ "وہ بالکل وہی انسان ہے جس کی اس ملک کو زندہ رہنے کے لیے ضرورت ہے۔ اور وہ اس وقت ایک ایسی آفت کے بالکل نشانے پر بیٹھی ہے جسے یہ نظام اپنی مجرمانہ غفلت کے ذریعے خود دعوت دے رہا ہے۔"

ان کے درمیان چھائی خاموشی ان ٹوٹے ہوئے نظاموں کے بوجھ سے مزید گہری ہو گئی جنہیں وہ درست کرنے کی تگ و دو کر رہے تھے۔

زوبیہ نے اپنا بیگ اٹھایا۔ "مجھے وہ ڈیٹا اور کونسل کے رابطے آج رات ہی بھیج دینا۔ میں میڈیا میں تمہاری شنوائی کا پورا بندوبست کر دوں گی۔ اور پھر، میں ان ڈیجیٹل اینکھوں کا سراغ لگانے والا موی نکل جاؤں گی۔"

شایان اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر کچھ نوٹ رکھ دیے۔ "اور میں وزارتِ مالیات کو باور کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اور اس کے بعد۔۔۔" اس نے شمال کی طرف دیکھا۔ "مجھے یہ رستہ نکالنا ہے کہ حیدر پور کے لوگ اس پہاڑ کے گرنے سے پہلے اس بستی کی خاموش پکار سن لیں۔"

"اپنا خیال رکھنا، شایان،" زوبیہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

"تم بھی،" شایان نے جواب دیا۔ "یہ مافیاز اپنے شکار کیے جانے کو پسند نہیں کرتے۔"

باب-8

وادیِ پرخار

شاہراہِ قراقرم-

شاہراہِ قراقرم انسانی تکبر کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ یہ اسفالٹ کا ایک ایسا ٹکڑا راستہ ہے جو دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلوں کے آپسی ٹکراؤ کے زون کو چیرتا ہوا بنایا گیا ہے؛ ایک ایسی جگہ جہاں زمین اب بھی متحرک ہے، خبردار کر رہی ہے، ٹوٹ رہی ہے اور مسلسل بکھر رہی ہے۔

لینڈ کروزر کے کیبن کے اندر، کھردری سڑک پر ٹائروں کی مسلسل سراہٹ ہی واحد مستقل آواز تھی۔ اگلی سیٹ پر، جاوید نامی ایک منجھے ہوئے ڈرائیور نے ایک ہاتھ بڑی مہارت سے اسٹیرنگ پر رکھتے ہوئے پہاڑ کے ان اندھے موڑوں کو سنبھال رکھا تھا۔ شایان ملک چھپلی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر نیچے دریائے سندھ کے گرجتے ہوئے میالے پانی کو تک رہا تھا۔ اس کے ساتھ فلوریس ایورز بیٹھا تھا۔ فلوریس دی ہیگ (The Hague) کے ایک بین الاقوامی غیر سرکاری ادارے سے تعلق رکھنے والا کہنہ مشق ریسرچر تھا، جسے پورے جنوبی ایشیا میں موسمیاتی موافقت اور ڈیزاسٹر رسک ریڈکشن (DRR) کی حکمت عملیوں کے آڈٹ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

ان سطحی اور ہوائی کنسلٹنٹس کے برعکس جن سے شایان کو شدید چڑچڑاہٹ، فلوریس حد درجہ حقیقت پسند اور گہرا مشاہدہ رکھنے والا انسان تھا؛ وہ کسی سرینا ہٹل کے کانفرنس روم میں بیٹھ کر رپورٹیں پڑھنے کے بجائے کسی بھی بحران کے اس آخری اور اصل سرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کو ترجیح دیتا تھا۔

"عالمی ماڈلز،" فلوریس نے انجن کے شور کے اوپر اپنی انگریزی میں خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ "وہ اس پورے خطے کو مکمل طور پر سرخ رنگ (خطرے) میں دکھاتے ہیں۔ یورپی ایجنسیاں صرف ڈیٹا دیکھتی ہیں۔ گلیشیرز کا پگھلنا، زلزلے کی پوزیشن۔ مگر

دی ہیگ میں بیٹھ کر ایکسل شیٹس کو دیکھنا آپ کو اس عمودی بلندی اور اس کی ہولناکی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں کرتا۔"

'یہ اعداد و شمار ہمیشہ استحکام کا مفروضہ لے کر چلتے ہیں،' شایان نے کھڑکی سے رخ موڑتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ یہ مان کر چلتے ہیں کہ زمین پر کوئی ایسا بنیادی ڈھانچہ موجود ہے جس پر آپ مزید کچھ تعمیر کر سکیں۔ پاکستان کے پاس اب کوئی ماحولیاتی استحکام یا مین لائن پکی ہی نہیں ہے، فلوریس۔ ہمیں اگلی آفت کے آنے سے پہلے سنہلنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ ہم مستقل اور جکڑے ہوئے صدموں کی کیفیت میں ہیں، اور یہ صرف یہاں اوپر ان پہاڑوں میں ہی نہیں ہو رہا ہے۔"

فلوریس نے اپنی چھوٹی نوٹ بک نکالی، پین تیار تھا۔ "مگر ڈیٹا کا پورا زور گلیشیئر ز کے کھلنے پر ہی ہے۔"

"کیونکہ برف کی تصویریں سکریں پر بہت سنسنی خیز اور اثر انگیز دکھتی ہیں،" شایان نے صاف لفظوں میں کہا۔ "مگر یہ زوال ہر جگہ ہے۔ نیچے جنوب میں، ٹمبر کارلٹز سندھ کے ساحلوں پر پھیلے ہوئے تمر کے جنگلات (mangroves) کا بے دردی سے صفایا کر رہے ہیں۔ وہ سمندری طوفانوں کے خلاف ہماری واحد قدرتی دفاعی لکیر کو ختم کر رہے ہیں، سمندری حیات کو برباد کر رہے ہیں، اور کراچی کی قاتل ہیٹ دیوز کو براہ راست ہوا دے رہے ہیں۔ پنجاب میں، سیاسی اشرافیہ ان غیر قانونی شوگر ملوں اور صنعتی یونٹس کی مالک ہے جو اپنا زہریلا اور غیر ٹریٹ کیا ہوا کیمیکل والا پانی سیدھا ہماری میٹھے پانی کی نہروں میں پمپ کر دیتے ہیں۔ ان ماحولیاتی معیارات کا نفاذ کوئی نہیں کرتا کیونکہ یہ آلودگی پھیلانے کے ذمہ دار خود اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے ہیں۔"

فلوریس نے لکھنا بند کر دیا، اس کے ماتھے پر ہل آئے۔ "اور زراعت کا شعبہ؟"

"اس کا دم گھٹ رہا ہے،" شایان نے جھنجھلاہٹ سے اپنے لہجے کو سخت کرتے ہوئے سمجھایا۔ "ہمارے پاس بلوچستان اور جنوبی پنجاب کے وہ صحرائی بیلٹس ہیں جو پانچ پانچ سال کی خشک سالی سے مر رہے ہیں، جبکہ یہاں سے چند سو میل کے فاصلے پر، دریا کے کناروں پر بیٹھے کسان سیلاب کے مستقل ریلوں میں اپنی پوری زندگی کی کمائی کھودیتے ہیں۔ اور جہاں پانی کا نظام مستحکم ہے بھی، وہاں برسات کا پورا کینڈر بدل چکا ہے۔ بارشیں مہینوں تاخیر سے آتی ہیں، یا پھر وہ پورے سال کا پانی صرف تین دن میں ایک ساتھ برسا دیتی ہیں۔ ہماری زراعت کا پورا نظام ہی بکھر رہا ہے۔ ہم ایک ساتھ پانچ مختلف محاذوں پر جنگ لڑ رہے ہیں، فلوریس، اور تمہارے یہ یورپی ماڈل صرف چوٹیوں پر جمی برف کو ناپ رہے ہیں۔"

فلوریس نے دھیرے سے سر ہلایا۔ "اور یہی وجہ ہے کہ میرا بورڈ اس وقت شدید الجھن کا شکار ہے۔ ہم اسلام آباد میں ان DRR گرانٹس اور بقا کی صلاحیت بڑھانے کے نام پر لاکھوں یورو بہا دیتے ہیں۔ مگر جب بھی زمین پر کوئی معمولی سا صدمہ

آتا ہے، پورا نظام دوبارہ صفر پر آگرتا ہے۔"

"کیونکہ تم لوگ صرف اس بند کمرے کے اس غوغا (echo chamber) کو فونڈنگ دے رہے ہو،" شایان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

فلوریس نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ "وضاحت کرو۔"

شایان نے دریا کے دوسری طرف پہاڑی ڈھلان پر چمپے مٹی اور پتھروں سے بنے ان چھوٹے، ناپائیدار گھروں کے جھرمٹ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بین الاقوامی پیسہ ان بڑی بڑی این جی اوز اور تھنک ٹینکس کی جیبوں میں جاتا ہے جن کے ہیڈ کوارٹرز اسلام آباد، لاہور اور کراچی میں واقع ہیں۔ وہ یہ پیسہ منگے اور پرنٹیش سیمینارز پر اڑا دیتے ہیں۔ وہ 'مقامی سطح پر موافقت' کے عنوان پر چمکدار اور خوبصورت بروشرز چھاپتے ہیں اور کسی اچانک سیلاب کے بعد چند مکمل بانٹتے ہوئے تصویریں کھنچوا لیتے ہیں۔ یہ غربت کی فریچا جتا رہے۔ یہ 'ماحولیاتی ٹورازم' ہے؛ آفت کے طبع پر کھڑی ایک انتہائی منافع بخش صنعت۔"

"اور اصل موافقت؟"

"اوپر سے نیچے تک، زمین پر حقیقی اور مقامی سطح کی کوئی موافقت موجود ہی نہیں ہے،" شایان نے کہا۔ "حقیقی DRR کا مطلب یہ ہے کہ تم اس ٹمبر مافیا کے سامنے کھڑے ہو کر کہو کہ وہ ان پہاڑیوں کو تھامنے والے صنوبر کے درخت نہیں کاٹ سکتے تاکہ پتھروں کے طوفان کو روکا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان دیہاتوں میں انانج کے گودام اور طبی ڈسپنسریاں بناؤ جو لینڈ سلائیڈز کی وجہ سے دنیا سے کٹ جاتے ہیں۔ مگر یہ بڑی این جی اوز ان کارٹلز یا مقامی سیاستدانوں سے کوئی دشمنی نہیں مول لینا چاہتیں۔ چنانچہ، وہ ایک اور ورکشاپ کروا دیتی ہیں۔"

گھٹنے بھر بعد، وہ بشارم کے پاس ایک سڑک کنارے بنے ڈھابے پر رکے۔ فضا میں ڈیزل کے دھوئیں اور بجھنے ہوئے گوشت کی تیز بو بھیلی تھی۔ وہ کپڑے کے ایک پرانے سائبان تلے بان کی چار پائیوں پر بیٹھ گئے جبکہ ان کا ڈرائیور، جاوید جلدی سے کھانا کھانے لگا۔ ایک چھوٹا لڑکا ان کے لیے مٹی کے چٹھے ہوئے ٹنگ میں لالچے والی کڑک چائے لے کر آیا۔

"افریقہ کے اپنے پچھلے آڈٹس کے دوران میں نے دیکھا تھا،" فلوریس نے چائے پر پھونک مارتے ہوئے بات شروع کی، "کہ ماحولیاتی صدے تقریباً فوراً ہی عورتوں کیلئے ایک شدید بحران کو جنم دیتے ہیں۔ کیا وہ منظر نامہ یہاں بھی ہے؟"

"یہاں وہ منظر نامہ کثیر الجہتی شکل اختیار کر لیتا ہے،" شایان نے گرمگ کو اپنے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی آفت آتی ہے۔ ان پہاڑوں میں پتھروں کو طوفان یا جنوب میں خشک سالی۔ تو مرد وہاں سے کسی نہ کسی طور نکل جاتے ہیں۔ وہ شہروں کی طرف دیہاڑی دار مزدوری کی تلاش میں ہجرت کر جاتے ہیں۔ اور عورتیں، جوان لڑکیاں اور بچے اس بلے کے بیچ پیچھے اکیلے رہ جاتے ہیں۔"

اس نے فلوریس کی آنکھوں میں دیکھا، تاکہ وہ ریسرچر اس اندھے پہلو کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کر سکے۔ "یہ امدادی ادارے چاول کے چند بکس وہاں بھیجتے ہیں اور اسے امداد کا نام دے دیتے ہیں۔ مگر وہ ان آفت زدہ علاقوں میں پیچھے رہ جانے والی خواتین کی حیاتیاتی حقیقت اور ضروریات کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب کیمرے وہاں سے ہٹ جاتے ہیں، تو وہ بالکل لاوارث رہ جاتی ہیں۔ وہاں عورتوں کیلئے حفظانِ صحت کا کوئی سامان موجود نہیں ہوتا۔"

اس نے بات جاری رکھی "جوان لڑکیاں ان عارضی اور ٹوٹے ہوئے سکولوں کو بھی چھوڑ دیتی ہیں جو کسی طرح بلے سے بچے ہوں، کیونکہ وہ ان حالات میں خود کو سنبھال نہیں پاتیں۔ حاملہ خواتین اس ٹوٹے ہوئے رستے پر میلوں پیدل چل کر کسی کلینک کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ یہ ماحولیاتی آفت صرف ان کے گھر نہیں اجاڑتی فلوریس، یہ ان سے ان کا وقار اور ان کی صحت بھی چھین لیتی ہے۔"

فلوریس نے اس بھرے ہوئے دریا کی طرف دیکھا، شایان کے الفاظ کی برہنہ سچائی اس کے وجود پر گہری منطبق ہو رہی تھی۔ "ہم صرف انفراسٹرکچر کو فنڈ دیتے ہیں،" وہ بڑبڑایا۔ "ہم زندگی بچانے اور بقا کو فنڈ نہیں دیتے۔"

"درست، تم صرف کنکریٹ کو فنڈ دیتے ہو،" شایان نے نرمی سے اس کی تصحیح کی۔ "مگر بقا کنکریٹ کا نام نہیں ہے۔ یہ بلوچستان کی وہ ٹیچر ہے جو بنیادی حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔ یہ وہ مقامی ڈاکٹر ہے جو اس آفت کے بالکل نشانے پر ایک کلینک بنا کر بیٹھی ہے کیونکہ ریاست اس وادی کو لاوارث چھوڑ چکی تھی۔"

"جیسے حیدر پور کی وہ ڈاکٹر،" فلوریس نے یاد دلایا۔ شایان نے اسے ان کی آخری منزل کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔ "ڈاکٹر پاریسہ۔"

"بالکل پاریسہ کی طرح،" شایان نے سر ہلایا، اس کے سینے میں ایک گہری گرہ سی لگ گئی۔ انہوں نے چائے ختم کی اور دوبارہ راستے پر نکل پڑے۔ جیسے جیسے وہ شاہراہِ قراقرم کے مزید اندر دھنستے جا رہے تھے، منظر نامہ پہلے سے کہیں زیادہ ٹیکھا اور سنگلاخ

ہوتا جا رہا تھا۔ سہ پہر کے آخری حصے تک، سڑک نے ایک شدید اور پریچ بلندی کی طرف چڑھنا شروع کر دیا۔ درجہ حرارت یکبارگی گر گیا تھا۔

جاوید نے لینڈ کروزر کو ہائی وے کے کچے کنارے پر دھیرے سے روکا اور انجن بند کر دیا۔ ان کے بالکل نیچے عشق آباد جھیل پھیلی تھی۔ وہ پہاڑوں کی تیکھی چوٹیوں کے بیچ میلوں تک پھیلی فیروزی رنگ کا ایک سحر انگیز، مگر غیر قدرتی شاہکار تھی۔ مگر یہ خوبصورتی ایک گہرا دھوکہ تھی۔

شایان گاڑی سے باہر نکلا اور حفاظتی جنگلے کے کنارے تک آ گیا۔ فلوریس بھی دور بین تھا اس کے پیچھے باہر نکل آیا۔ "خدا یا۔۔۔" فلوریس کے حلق سے ایک مدہم سانس نکلی، اس کی نظریں جھیل کے آخری سرے پر جمی تھیں۔ وہ پانی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اس بند (dam) کو دیکھ رہا تھا۔ مٹی، چٹانوں اور لمبے کا ایک ایسا بے ترتیب اور خوفناک اکٹھ جس نے برسوں پہلے ایک عظیم لینڈ سلائڈ کے بعد اس پورے دریا کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اور اس جھیل کے بالکل اوپر، ان پسماندہ اور ناپائیدار ڈھلوانوں پر کنکریٹ کے پانچ الگ الگ، کثیر المنزلہ ہوٹل کھڑے تھے، جن کی بنیادیں بالکل اس فالٹ لائن کے پیٹ کو کاٹ کر رکھی گئی تھیں۔

"لینڈ فاما،" شایان نے کہا، اس کی آواز ہوا کے شور میں بمشکل ایک سرگوشی تھی۔ "انہوں نے این او سیز (permits) خریدے اور فالٹ لائن پر یہ سب کھڑا کر دیا۔ وہ اسے پر تعیش ٹورازم کا نام دے کر بیچتے ہیں۔"

"اگر یہ ڈھلوان بیٹھ گئی تو۔۔۔" فلوریس نے اپنے ذہن میں اس کی فزکس کا حساب لگاتے ہوئے بات شروع کی۔

"اگر یہ ڈھلوان بیٹھ گئی،" شایان نے بات پوری کی، اس کی نظریں پانی کے بہاؤ کے رستے پر جمی تھیں، "تو لاکھوں ٹن کنکریٹ اور چٹانیں ایک ساتھ اس جھیل میں گریں گی۔ اس سے پانی کا ایک عظیم سونامی ابھرے گا جو اس مٹی کے عارضی بند کو اڑا کر لے جائے گا۔ یہ انسانی لالچ کی تیار کردہ ایک ہولناک آفت ہوگی۔"

شایان مڑا اور اس نے اس عارضی بند کے بالکل نیچے واقع ایک تنگ، گہری اور عمودی وادی کی طرف اشارہ کیا۔ دریا کے پاٹ کے ساتھ ساتھ پھیلی، پتروں اور لکڑی سے بنے گھروں کی ایک گنجان بستی موجود تھا، جو اس آنے والے پانی کی دیوار کے آگے بالکل نہتی اور بے بس کھڑی تھی۔ "وہ حیدر پور ہے،" شایان نے کہا، اور وہ خوف بالآخر اس کے روایتی پالیسی ساز چہرے کو چیر کر باہر آ گیا۔ "اور وقت اب ہمارے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔"

باب-9

باکو کی پرچھائی گلگت بلتستان۔

فلوریس ایورزا گلی ہی صبح روانہ ہو گیا۔ وہ گلگت کے ٹرانسپورٹ اڈے کے قریب ایک دوسرے سے جدا ہوئے؛ اس ڈیجریس چر نے پسماندہ اور خشک سالی کے مارے زرعی ٹیلٹس کا جائزہ لینے کے لیے رحیم یار خان کے میدانوں کی طرف جانا تھا اور اس کی گاڑی روانگی کیلئے تیار کھڑی تھی۔

"تم بالکل صحیح تھے، شایان،" جیپ میں سوار ہونے سے پہلے اس نے شایان سے مضبوطی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "ایکسل شیش واقعاً اندھی ہوتی ہیں۔ میں آج رات ہی دی ہیگ کو اپنی ابتدائی رپورٹ بھیج دوں گا۔ میں سفارش کر رہا ہوں کہ جب تک مقامی حکومتیں زوننگ کے قوانین نافذ نہیں کرتیں، ان کنکریٹ کے ریزیلینس سینٹرز کی ہر قسم کی فنڈنگ فوراً روک دی جائے۔"

"اپنی آواز کو وہاں پوری قوت دینا، فلوریس،" شایان نے جواب دیا۔ "خدا حافظ، امید ہے تمہارا سفر محفوظ رہے گا۔"

فلوریس کے جانے کے بعد، وہ پیشہ ورانہ اور تجرباتی سردمہر چہرا جو شایان عام طور پر اوڑھے رکھتا تھا، یکسر غائب ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کا شور اب اس کا دم گھونٹ رہا تھا۔ اس نے ایک مقامی ڈرائیور کو ہانڑ کیا اور حیدر پور کی اس تنگ اور عودی وادی کی طرف اترتے ہوئے دوبارہ اسی پہاڑ کے سائے کا رخ کر لیا۔

وہ گاؤں حد درجہ سحر انگیز تھا۔ خوبانی اور چیری کے درختوں کے سیڑھی نما کھیت ان تیکھی ڈھلوانوں سے نیچے بہتے ہوئے دکھتے تھے، جن کے پتوں بیچ ندی کے پتھروں اور پرانی لکڑی سے بنے گھروں کو ایک خوبصورت فریم مل رہا تھا۔ یہ جگہ ایک گہرے اور

پرسکون صبر کا شاہ کا تھی۔ مگر جیسے ہی شایان نے سر اٹھایا اور وادی کی ان دیواروں کے پھیلاؤ کا جائزہ لیا، اسے وہاں صرف جلاوٹ کی ٹنگی لتوا نظر آئی۔

عشق آباد جھیل کا وہ عارضی مٹی کا بند ان کے بالکل اوپر سر اٹھائے کھڑا گراں گزر رہا تھا، اور پانی کے بوجھ اور اس کے اوپر ناپائیدار فالٹ لائنز پر کاٹے گئے ان کنکریٹ کے ہونٹوں کے بھاری وزن تلے سسک رہا تھا۔ شایان نے ڈکلیٹ کر کے ڈرائیور کو گاؤں کے بازار کے کنارے پر گاڑی روکنے کو کہا۔ وہ مٹی کی اس سڑک کے آخری سرے پر واقع ایک چھوٹی، سفیدی مائل عمارت کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ اس پر اردو اور انگریزی میں ایک ہاتھ سے لکھا ہوا سائن بورڈ آویزاں تھا: "حیدر پور کمیونٹی ہیلتھ کلینک"۔

وہ اندر داخل ہوا۔ انتظار گاہ کھانستے ہوئے بوڑھے مردوں اور بخار سے تپتے بچوں کو گود میں لیے ماؤں سے بھری پڑی تھی۔ اور اس پورے منظم شور کے مرکز میں، حدودِ درجہ پرسکون اور ربع دار وقار کے ساتھ متحرک، ڈاکٹر پاریسہ موجود تھی۔ اس نے گہرے سبز رنگ کے ایک سادہ شلووار قمیص کے اوپر ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہن رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ ایک فکر مند ماں کو دوا کا نسخہ دینے کے لیے مڑی، اس کی نظر چوکھٹ پر کھڑے شایان پر پڑی۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی، اور اس کی آنکھوں کے گرد جمی تھکن لمحے بھر کے لیے رفو ہو گئی۔ "شایان صاحب!" اس نے کاؤنٹر سے آگے بڑھتے ہوئے اسے آواز دی۔ "آپ واپس آ گئے۔"

وہ جب بھی اسے دیکھتا، اسے اپنے سینے پر ایک عجیب بوجھ کا احساس ہوتا تھا۔ شایان کی ہمدردی اور انسانیت لانتا ہی تھی۔ یہی اس کے پورے کیریئر کا نچوڑ تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس تباہی کے دہانے پر کھڑی وادی کا ایک ایک فرد یہاں سے ہجرت کر جائے۔ مگر پاریسہ کے لیے اس کی یہ بے چینی حدودِ جذباتی اور گہرا راز تھی۔

یہ ایک ایسا راز تھا جسے اس نے اپنے وجود میں اتنی گہرائی میں دفن کر رکھا تھا کہ وہ خود اس کے اپنے شعور کی روشنی تک بمشکل آ پاتا تھا۔ ڈاکٹر پاریسہ کی طرف دیکھنا وقت کے دھاگوں میں ایک عجیب سے شگاف میں جھانکنے جیسا تھا۔ ماضی سے جڑے ایک کردار اور پاریسہ کی آپسی شباهت ناقابلِ یقین حد تک جبرِ تناک تھی۔ ان کے جڑے کی ساخت، ان کی آنکھوں میں جمی وہ تپتی اور غیور ذہانت، یہاں تک کہ ان کے ہنسنے کا انداز — وہ کسی دوسری پاریسہ کا ایک جیتے جاگتے وجود کا عکس تھی۔

باکو، آذربائیجان۔ برسوں پرانی بات۔ وہ یاد پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے وجود پر طاری ہو گئی۔ سردیوں میں، بحیرہ کاسپین

کی وہ بو۔ پرانے شہر کی پتھرلی گلیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی وہ کاٹ دار ہوا۔ وہ جوان تھا، بے فکر تھا، اور پاریسہ نامی ایک لڑکی کے سحر میں پوری طرح گرفتار تھا۔ وہ ایک طوفان جیسی شخصیت تھی۔ برجستہ، غیر متوقع اور حد درجہ خوددار۔ انہوں نے چند مختصر مگر روشن مہینے ایک ساتھ گزارے تھے جنہوں نے اس کے دل کے پورے ڈھانچے کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا تھا۔ پھر زندگی کی بے رحم موجوں نے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔

وہ پاکستان لوٹ آیا، وہ مغرب کی طرف نکل گئی۔ اس نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ پوری صراحت کے ساتھ جانتا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی یہ نوجوان ڈاکٹر اس کی وہ کھوئی ہوئی محبت نہیں تھی۔ یہ تو بس کائنات کا ایک عجیب اتفاق تھا، ایک ایسا عکس جس کا نام اور چہرہ ایک تھا۔ شایان کے ذہن میں کوئی رومانوی سراب نہیں تھا، نہ ہی اس کے ماضی اور اس کے حال کے درمیان کا فاصلہ مٹانے کی کوئی دبی ہوئی خواہش تھی۔ اس نوجوان ڈاکٹر سے اس کا تعلق خالصتاً ایک حفاظتی اور ہمدردانہ تھا۔ وہ بس اسے محفوظ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ دنیا کے کسی کو نے میں، ان آنکھوں اور اس جذبے والی ایک پاریسہ ایک طویل اور خوشحال زندگی جی رہی ہے۔

"ہاں، میں واپس آ گیا ہوں،" شایان نے باکو کے ان آسیہوں کو دوبارہ اندھیرے کے سپرد کرتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔ اس نے کلینک کے بند ہونے کا انتظار کیا۔ وہ عمارت کے پیچھے بنے لکڑی کے ایک بیچ پر بیٹھ گئے، جہاں سے گرجتا ہوا دریا صاف دکھتا تھا۔

پاریسہ نے اسے چائے کا ایک کپ تھمایا، اس کے ہاتھوں سے اینٹی سپٹک صابن کی دھیمی سی بو آرہی تھی۔ "خیریت؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ "آپ کے چہرے پر وہی تاثرات ہیں، شایان صاحب۔ ایسا دکھ رہا ہے جیسے آپ اس پورے پہاڑ کا بوجھ اکیلے اٹھائے پھر رہے ہوں۔"

"میں اس پہاڑ کے بارے میں ہی فکر مند ہوں،" شایان نے اعتراف کیا، چائے ہاتھ میں تھی مگر اس نے اس کا گھونٹ نہیں بھرا۔ وہ اس کی طرف مڑا، اس کی آواز میں اب وہ پوری صاف گوئی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ "پاریسہ، تمہیں حیدر پور چھوڑنا ہوگا۔ تمہیں اپنا سامان باندھنا چاہیے، اپنے خاندان کو ساتھ لو اور گلگت منتقل ہو جاؤ۔ یا اسلام آباد چلے جاؤ۔ اس جگہ کے سوا کہیں بھی۔"

پاریسہ کی مسکراہٹ مدہم پڑ گئی۔ "شایان، ہم اس پر پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ کلینک کو ابھی ایک نیا سولر انکوپیشن سسٹم ملا ہے۔

اگلے مہینے میرے پاس تین خواتین کے کیمیز ہیں جن کی ڈیلیوری ہوئی ہے اور وہ۔۔۔"

"وہ جھیل پھٹنے والی ہے،" شایان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، وہ گھبراہٹ بالآخر اس کے لہجے سے چھلک پڑی۔ "میں ابھی اوپر ایک یورپی ماحولیاتی ماہر کے ساتھ ہو کر آیا ہوں۔ گرمی کی شدت ان گلیشیرز کو پگھلا رہی ہے جو اسے بھر رہے ہیں، اور پانی کا لیول اس وقت خطرے کے نشان پر ہے۔ مگر اصل خطرہ یہ بھی نہیں ہے۔ لینڈ مافیا نے اس فالٹ لائن کے بالکل اوپر کنکریٹ کے پانچ ہول کھڑے کر دیے ہیں۔ جب شدید برسات ہوگی، تو وہ پوری ڈھلوان بیٹھ جائے گی۔ لاکھوں ٹن کنکریٹ اور چٹانیں جھیل میں جاگریں گی، اور اس سے اٹھنے والا سونامی اس مٹی کے بند کو ملیا میٹ کر دے گا۔" اس نے ان کے قدموں میں بہتے گرجتے دریا کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ پانی اپنے کناروں میں نہیں رہے گا۔ وہ ان ہوٹلوں کے کنکریٹ کو کسی توپ کے گولوں کی طرح اس وادی میں نیچے لے کر برسے گا۔ وہ حیدر پور کو نقشہ سے منادے گا۔ تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

پاریس نے دریا کی طرف دیکھا، اور پھر دور نظر آتے اس مٹی کے بند کے نادیہ سائے کو گھورا۔ اس نے سائنس پر کوئی بحث نہیں کی؛ وہ عقل اور لاجک کی مالک خاتون تھی اور اچھے سے جانتی تھی کہ پہاڑ ناپائیدار ہے۔

"میں آپ کی بات مانتی ہوں،" پاریس نے دھیمی آواز میں کہا۔

تو پھر مجھے تمہاری منتقلی کا بندوبست کرنے دو،" شایان نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "اسلام آباد میں میرے بہت سے رابطے ہیں۔ میں تمہیں کسی بڑے ہسپتال میں پوزیشن دلوا سکتا ہوں۔ تم حد درجہ قابل ہو پاریس۔ تم کہیں بھی رہ کر جانیں بچا سکتی ہو۔"

وہ مڑی اور اس نے شایان کی طرف دیکھا، اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک اداس مگر غیر متزلزل عزم جھلک رہا تھا۔ یہ بالکل وہی تاثر تھا جو باکو کی پاریس نے اسے اس دن دیا تھا جب وہ جدا ہوئے تھے۔

"میں کہیں بھی رہ کر جانیں بچا سکتی ہوں،" پاریس نے اس کی بات تسلیم کی۔ "مگر ان لوگوں کا میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ حکومت یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں بھیجتی۔ یہ بڑی این جی او کسی سانچے کے بعد صرف تصویریں کھینچوانے آتی ہیں۔ اگر آدھی رات کو کسی بچے کا بخار تپ جائے، یا کوئی کسان کھیت میں کام کرتے ہوئے زخمی ہو جائے، تو ان کے اور موت کے درمیان کھڑی واحد دیوار میں ہی ہوں۔"

"اگر تم خود تیس فٹ پانی اور کنکریٹ تلے دفن ہو گئیں، تو تم ان کا علاج نہیں کر پاؤ گی،" شایان نے بھرائی ہوئی آواز میں دلیل دی۔

"اگر یہ لوگ یہاں ہیں، تو میں بھی یہاں ہوں۔ اگر یہ رکس گے، تو میں بھی رکوں گی،" پاریسہ نے کہا، اس کا لہجہ نرم تھا مگر وہ ارادہ فولاد کا تھا۔ "یہ میرا گھر ہے، شایان۔ یہ میرے لوگ ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ پہاڑ نازک ہے، مگر میں ان حالات میں انہیں لاوارث چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتی۔"

شایان اسے تکتا رہا، ایک ہولناک حقیقت اس کے وجود پر چھا گئی۔ وہ اسے اس وادی سے باہر کھینچ کر اس کی جان نہیں بچا سکتا تھا۔ اس کی ہمدردی اور انسانیت بھی اتنی ہی انتہا کی تھی جتنی کہ اس کی اپنی۔ وہ اس مٹی، ان لوگوں سے بندھ چکی تھی۔ اگر وہ اپنے ماضی کے اس آسیب (عکس) کو محفوظ دیکھنا چاہتا ہے، تو اسے اس پورے گاؤں کو بچانا ہو گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اوپر نظر آتے اس عارضی بند کے خطرناک سرے پر نظر جمائی۔ اسلام آباد میں حکومت خطرے کو دیکھنے سے انکار کر چکی تھی۔ مقامی انتظامیہ ہوٹل مافیا کی جیب میں تھی۔ کوئی سرکاری لاؤ لنگر انہیں بچانے نہیں آنے والا تھا۔

"اگر تم یہاں سے نہیں نکلو گی،" شایان نے جیسی مگر حد درجہ حتی سرگوشی میں کہا، "تو مجھے اس پہاڑ کے گرنے سے پہلے اس تمام علاقے کو خالی کرانے کا کوئی رستہ نکالنا ہو گا۔"

باب-10

صور اسرافیل

اسلام آباد- چینل 24/7 کانیزروم۔

نیوز روم کی چھت سے معلق ٹیلی ویژن اسکرینوں پر سرکاری چینل کی لائونشیاٹ چل رہی تھیں۔ پوڈیم پر وفاقی وزیر برائے سمندر پار پاکستانی کھڑے تھے، اور ان کے ہمراہ یورپی یونین کے مندوبین بھی موجود تھے۔ زوبیہ اپنی میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور اس کے چہرے پر ایک حقیقی مسکراہٹ بھی تھی۔

"۔۔۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج حکومت 'نیشنل سکلڈ مانیجنگ انیشیٹیو' (قومی ہنرمند ہجرت کا منصوبہ) کا آغاز کر رہی ہے،" وزیر صاحب کی تقریر گونجی، اور کیمروں کے فلیش ان کے چہرے کو روشن کر رہے تھے۔ "ہم اپنا پورا زامہ بدل رہے ہیں۔ غیر قانونی مگریشن پر صرف رد عمل دینے کے بجائے، ہم باقاعدہ اور ادارہ جاتی روابط قائم کر رہے ہیں۔ ہم پنجاب اور خیبر پختونخوا میں تین نئے جدید ترین فی تربیتی مراکز قائم کر رہے ہیں، جن کا نصاب اور سرٹیفیکیشنز براہ راست یورپی ممالک کی لیبر مارکیٹ کی ضروریات کے عین مطابق ہوں گے۔ ہم اپنے نوجوانوں کو ان کے مطلوبہ معیار سے لیس کر رہے ہیں تاکہ وہ محفوظ، باقاعدہ اور باوقار طریقوں سے بیرون ملک جاسکیں۔ یہ ہماری معیشت، تارکین وطن اور میزبان ممالک سب کے لیے یکساں فائدہ مند ہے۔۔۔"

ساحلی پٹی کا بحران—وہ کسان جو سمندر کی جارحیت کی وجہ سے کراچی کی کچی آبادیوں میں پناہ لینے پر مجبور تھے—اب بھی ایک المناک اور حل طلب المیہ تھا۔ مگر پنجاب اور خیبر پختونخوا کے ان بے روزگار نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے، ریاست نے بالآخر قانون کا ایک باقاعدہ دروازہ کھول دیا تھا۔ 'لالہ موسیٰ کہانی' کی وہ تفتیش اگرچہ سکریں پر کسی سنسنی خیز اسکیٹل کی طرح لائونہیں ہو سکتی تھی، مگر زوبیہ کی پس پردہ لابی، مسلسل دباؤ اور اس کی معاشی دلیل پر مبنی رپورٹنگ نے بندش یا نوں میں حرکت پیدا

کردی تھی۔

"معمولی کامیابی ہے، اس پر اتنا غور مت کرو؛ کچھ معاملات ہاتھ سے نکل رہے ہیں؛ ایک آواز آئی۔ زوبیہ نے مڑ کر دیکھا، سرمد اس کی طرف ایک پرنٹ آؤٹ بڑھا رہے تھے۔ یہ گزشتہ رات نشر ہونے والے پرائم ٹائم ٹاک شو کا ٹرانسکرپٹ تھا۔

"میں غور نہیں کر رہی سرمد، میں تو بس حکومت کو تاریخ میں پہلی بار اپنا کام ڈھنگ سے کرتے دیکھ کر حیران ہو رہی ہوں،" اس نے وہ کاغذ تھامتے ہوئے کہا۔

"انہوں نے یہ اس لیے کیا کیونکہ اس سے ملک میں غیر ملکی زرمبادلہ (remittances) آتا ہے،" سرمد نے ایک منجھے ہوئے صحافی کی طرح حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا۔ "مگر یہ مت سمجھنا کہ تم ہر محاذ پر جیت رہی ہو۔ زین کا یہ ٹرانسکرپٹ پڑھو۔ ٹمبر کاٹل اب پوری طاقت سے جوابی وار کر رہا ہے۔"

زوبیہ نے کاغذ پر نظریں دوڑائیں۔ زین نے اپنے شو کا ایک بڑا حصہ ایک نام نہاد 'ترقیاتی کنسلٹنٹ' کے انٹرویو پر صرف کیا تھا، جو سوات میں جنگلات کی کٹائی کی تمام رپورٹس کو 'غیر ملکی این جی اوز کے فنڈز سے چلنے والی ترقی دشمن سازش' قرار دے رہا تھا۔ ٹمبر مافیہ نے میڈیا کی پوری بساط پر اپنے مہرے اور دلال پھیلا دیے تھے، اور وہ پرائم ٹائم کی ایرویز خرید رہے تھے تاکہ محکمہ جنگلات کی طرف سے ان کے خلاف کسی بھی قسم کے آڈٹ کا راستہ روکا جاسکے۔

"وہ بہت گہری جڑیں رکھتے ہیں، زوبیہ،" سرمد نے خبردار کیا۔ "وہ تین بڑے نیٹ ورکس کو اپنے اشتہارات بند کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں اگر محکمہ جنگلات نے کوئی انکوائری شروع کی۔ تم نے ریچھ کے کھوہ میں ہاتھ ڈالا ہے، اور اب وہ ریچھ پورا جنگل خریدنے نکل پڑا ہے۔"

زوبیہ نے اس کاغذ کو اپنے ہاتھ میں مروڑ دیا۔ "وہ دلالوں کو تو خرید سکتے ہیں سرمد، مگر وہ کششِ ثقل (gravity) کو رشوت نہیں دے سکتے۔ وہ پہاڑی ڈھلوانیں ایک دن ضرور بیٹھیں گی۔"

اس سے پہلے کہ سرمد کوئی جواب دیتے، زوبیہ کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر کوئٹہ سے ڈاکٹر طاہرہ کا نام چمک رہا تھا۔ زوبیہ نیوز روم کے شور سے تھوڑا پرے ہٹ آئی۔

"ڈاکٹر طاہرہ! امید ہے آپ وزیر صاحب کی یہ مائیگریشن والی پریس کانفرنس دیکھ لی ہوگی۔"

"پریس کانفرنس کو گولی مارو!" دوسری طرف سے طاہرہ کی آواز آئی، جو جوش اور خوشی سے کانپ رہی تھی۔ "ٹی وی آن کر کے بجٹ تقریر سنو، کوئی بھی چینل، ابھی، اسی وقت!" زوبیہ نے قریبی میز سے ریموٹ اٹھایا اور سامنے لگی ایک مانیٹر اسکرین کا رخ بدلا۔ اسکرین کے نچلے حصے پر سرخ رنگ کی ایک بریکنگ نیوز کی پٹی فلش ہو رہی تھی: وفاقی وزارتِ مالیات کا بڑا ریلیف پیکیج؛ خواتین کی سینیٹری مصنوعات اور خام مال پر عائد تمام امپورٹ ڈیوٹیز اور جی ایس ٹی کو ختم کر دیا گیا۔

"وفاقی وزیر مالیات نے سب مان لیا،" طاہرہ نے فون پر تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ "ہم نے انہیں ماننے پر مجبور کر دیا زوبیہ! تمہارا وہ میڈیا کالمشترکہ کردار کام کر گیا، مارنگ شوز نے ہمارے فراہم کردہ ڈیٹا کے ذریعے ان کی نیندیں حرام رکھیں۔ انہوں نے ابھی فنانس بل میں اس کا اعلان کیا ہے۔ وہ خام مال کو زیرو ریٹنگ پر لا رہے ہیں اور لکڑی ٹیکس، جی ایس ٹی وغیرہ پوری طرح ختم کر دیا گیا ہے۔ یہ پورے ملک کی خواتین کی ایک تاریخی فتح ہے۔"

زوبیہ کے وجود میں فتح اور لہراتے ہوئے جوش کا ایک طوفان اٹھا۔ انہوں نے کر دکھایا تھا۔ انہوں نے اس وفاقی بیوروکریسی کے سنگلاخ قلعے میں شکاف ڈال دیا تھا۔ "ڈاکٹر طاہرہ، یہ ناقابل یقین ہے۔ اب بلوچستان کے سکولوں کا۔۔۔"

"صوبائی وزارتِ تعلیم نے اسی وقت صوبائی سکولوں کے لیے اس فنڈنگ اور خریداری کے آرڈرز کر دیے ہیں،" طاہرہ نے تصدیق کی۔ "ہم نے لڑکیوں کی ایک پوری نسل کو سکول چھوڑنے کی اس دلدل سے بچا لیا ہے، زوبیہ۔ مگر شایان کہاں ہے؟ میں دو گھنٹے سے اس کا نمبر گھما رہی ہوں۔ وہ اس پوری حکمت عملی کا معمار ہے۔ اس وقت فتح کا یہ جشن اس کا حق ہے۔"

"میں اسے ڈھونڈتی ہوں،" زوبیہ نے مسکراتے ہوئے وعدہ کیا۔ "میں اس سے کہوں گی کہ وہ آپ کو فوراً کال کرے۔" اس نے فون بند کیا اور فوراً شایان کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ اس کامیابی کا جشن ساتھ منانا چاہتی تھی۔ وہ سچا تھا۔ اس منظم اور چوکھی وار نے نظام کو ایک ایسے کونے میں لاکھڑا کیا تھا جہاں ان کے پاس جھکنے کے سوا کوئی رستہ نہیں بچا تھا۔

مگروفن پر کھنٹی نہیں بجی۔ اس کی جگہ ایک سرو، خود کار مشینی آواز گونجی۔ "آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت نیٹ ورک کو تنج ایریا سے باہر ہے۔" زوبیہ کے ماتھے پر بل آئے۔ اس نے واٹس ایپ کھولا۔ اس نے صبح اسے ایک میج بھیجا تھا، مگر وہاں اب بھی صرف ایک گرے ٹک (Single Tick) موجود تھا۔

"شایان، تم کہاں غائب ہو؟" اس نے خود کلامی کی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس ڈیج ریسرچر کے ساتھ شمال کی طرف نکلا تھا، مگر شاہراہِ قراقرم کے آس پاس عام طور پر گلگت کے سنگلز تو ٹھیک ہی ملتے تھے۔ وہ واپس اپنے کام میں جٹ گئی، شام کے نیوز

بلیٹن کی سرخیاں تیار ہونے لگیں، اور اس کا ذہن ان دونوں کامیابیوں کے سرور سے چمک رہا تھا۔ مگر جیسے جیسے گھٹے بیتتے گئے اور سورج مارگلہ کی پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتا چلا گیا، اس کے دل میں ایک عجیب سی سرد اور گہری بے چینی میٹھنے لگی۔ شایان کبھی اس طرح غائب نہیں ہوتا تھا جب کوئی بڑی پالیسی میز پر پڑی ہو۔

رات کے آٹھ بجے تک، وہ اسے سات بار فون کر چکی تھی۔ مگر ہر بار وہی مہیب خاموشی تھی۔ پونے نو بجے، وہ نیٹ ورک کی بیسمنٹ پارکنگ میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی جب اس کے ہاتھ میں پکڑا فون اچانک وابریٹ ہوا۔ اس نے بنا دیکھے فون کان سے لگایا۔ "شایان؟"

"... زوبیہ..." وہ آواز بمشکل پہچانی جا رہی تھی۔ وہ شایان ہی تھا، مگر اس کی آواز کٹ رہی تھی، لہریں بکھر رہی تھیں اور پس منظر میں ایک ہولناک، کان پھاڑ دینے والا شور گونج رہا تھا۔ وہ آواز کسی پھرے ہوئے جیٹ انجن جیسی تھی، یا جیسے پورا پہاڑ اپنے اندر سے پھٹ رہا ہو۔

"شایان! مجھے تمہاری آواز بالکل سنائی نہیں دے رہی! تم کہاں ہو؟" وہ پارکنگ کی خاموشی میں چلائی، اس نے فون کو اپنے کان پر سختی سے بھینچ لیا تھا۔ "ٹیکس اصلاحات کا بل پاس ہو گیا ہے! تم جیت گئے ہو!"

"... میری بات سنو..." شایان کی آواز اس پس منظر کے شور کو چیرتی ہوئی آئی، وہ ہانپ رہا تھا اور اس کے لہجے میں بلا کی جلدی تھی۔ "عشق آباد... وہ ڈھلوان بیٹھ گئی ہے۔ جھیل... مٹی کا وہ بند ٹوٹ رہا ہے..."

زوبیہ کے وجود سے جیسے پورا خون نچڑ گیا۔ پتھروں کا وہ طوفان! "شایان! کسی اونچی جگہ بھاگو! کیا تم محفوظ ہو؟"

"... سرکاری انتظام... بہت سست ہے... وادی میں قیامت مچی ہے..." پس منظر میں دوبارہ کسی بھاری لکڑی کے تاش کے پتوں کی طرح ٹوٹنے کی ہولناک آواز آئی۔

"میں حیدر پور میں ہوں... پاریرے کے ساتھ... کلینک میں... ہم بھنسن گئے ہیں..."

"شایان! اس کلینک کو چھوڑو، بھاگو وہاں سے!" زوبیہ اس کنکریٹ کی پارکنگ میں چینی، اس جغرافیے کی ہولناکی اب اس کے ذہن پر چھا چکی تھی۔ حیدر پور بالکل اس بھاؤ کے رستے کے دہانے پر واقع تھا۔

"... انہیں ہوا باز (aviation) چاہیے ہوں گے... این ڈی ایم اے (NDMA) کو اس تباہی کے پیمانے کا اندازہ

نہیں ہے۔۔۔ انہیں بتاؤ۔۔۔" اس کی آواز مدہم ہوئی، جیسے وہ یکخت کسی بہت گہرے کنویں میں چلی گئی ہو۔ "انہیں بتاؤ زویہ کہ وقت اب ختم ہو چکا ہے۔۔۔" لائن بالکل کٹ گئی۔

زویہ اس سرڈنکرہٹ کی پارکنگ میں بالکل پتھر کی ہو کر رہ گئی، اور اس کی نظریں سکرین پر جم گئیں۔ وہ رابطہ صرف اٹھارہ سیکنڈ قائم رہا تھا۔ وہ پالیسیوں کی تمام فتوحات، وہ ٹیکس اصلاحات، وہ ہنرمندانہ ہجرت کے قانونی راستے۔۔۔ سب کچھ لمحے بھر میں غائب ہو گیا، اور اس کی جگہ موسمیاتی نظام کے اس وحشیانہ اور مادی بلے نے لے لی تھی جو اس وقت اس شخص پر ٹوٹ رہا تھا جس نے اسے درست کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی تھی۔

شایان اس گلیشیر کے سونامی کے بالکل نشانے پر پھنس چکا تھا، اور ریاست کی وہ سست، روایتی اور کاغذی بیوروکریسی اسے وہاں مرنے کے لیے چھوڑنے والی تھی۔ زویہ گاڑی میں نہیں بیٹھی۔ وہ مڑی اور لفٹوں کی طرف بھاگی۔ اب اسے کوئی خبر نہیں لکھنی تھی۔ اسے ایک پورا ٹیلی ویژن نیٹ ورک ہائی جیک کرنا تھا، امداد کو متحرک کرنا تھا، اور اس حکومت کو اس پہاڑ کی طرف دیکھنے پر مجبور کرنا تھا اس سے پہلے کہ وہ اس کے دوست اور ایک پوری وادی کو زندہ مٹی تلے دفن کر دے۔

باب-11

پتھر برسے لگے

حیدر پور، گلگت بلتستان۔

پہاڑ کبھی اچانک نہیں بھرتا۔ اس بار بھی شروعات ایک انتہائی گہری، دھیمی سی لرزش سے ہوئی جس نے ڈاکٹر پارسیہ کی ادویات والی الماریوں میں رکھی شیشیوں کو لرزا کر کھدایا۔ یہ ایک اربٹن چٹانوں اور مٹی کی وہ خوفناک سراہٹ تھی جو زمین پر سے اپنی گرفت کھور ہے تھے۔

"شایان! سٹرپچر کو دوسری طرف سے تھامو!" پارسیہ چلائی، اس کی آواز کلینک میں پھیلتی ہوئی افراتفری کو چیرتی ہوئی نکلی۔ شایان آگے لپکا، اس نے لوہے کے ہینڈلز کو مضبوطی سے جکڑا۔ کینوس کی اس چادر پر ایک بوڑھا شخص لیٹا تھا، جس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ انہوں نے مل کر سٹرپچر کو اوپر اٹھایا، کلینک کے دوہرے دروازوں کو دھکیلا اور اس خوفناک، تاریک رات کے مہیب منظر میں باہر نکل آئے۔

حیدر پور کی وہ پوری وادی اس وقت ایک بے ترتیب اور اندھی بھگدڑ کا منظر پیش کر رہی تھی۔ 'انخلا کا سرکاری انتظام' بمشکل ایک گھنٹہ پہلے پہنچا تھا، وہ بھی صرف ایک پولیس کی چیپ کی شکل میں جو میگافون پر چیخ رہی تھی۔ مگر تب تک، بہت دیر ہو چکی تھی۔ وادی سے باہر جانے والی تنگ میٹلی سڑکیں پہلے ہی بند ہو چکے ٹریکٹرز، گھبرائے ہوئے مویشیوں اور ان لوگوں سے اٹی پڑی تھیں جو اپنی پیٹھ پر جتنا سامان لاد سکتے تھے، لاد کر بھاگ رہے تھے۔

"اوئے کھیتوں کی طرف چلو!" شایان اس پورے شور کو توڑتے ہوئے چلایا، اس کا ہاتھ دریا کے پاٹ سے بہت اوپر، پہاڑ کی دیوار پر تراشے گئے زری مٹی کے زینوں کی طرف تھا۔

"اوپر بھاگو! ہم سڑک پر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے! ہمیں بلندی پر چڑھنا ہوگا!" وہ پتھریلے اور ناہموار راستے پر اوپر کی طرف بڑھنے لگے، سڑیچر کے وزن تلے ان کے پیچھے جواب دینے لگے تھے۔ جیسے ہی شایان کے بوٹ اس باریک بجری پر پھسلے، اس کے ذہن نے اسے ماضی کے جھروکے میں لا پھینکا۔ اس منظر کی سراسر اور قابلِ علاج نااہلی اس کے سینے پر ایک وزنی پتھر کی طرح بیٹھ رہی تھی۔ اس نے یہ رات اپنے ذہن میں درجنوں بار بالکل اسی طرح چلتے دیکھی تھی، اور اس نے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھے لوگوں کو یہ بھیانک سچائی دکھانے کی کوشش بھی کی تھی۔

ماضی قریب کے واقعات فلم کی طرح اس کے ذہن میں دوڑ رہے تھے۔ چھ ماہ پہلے۔ اسلام آباد میں وفاقی سیکریٹریٹ کا ایک خنک ایئر کنڈیشنڈ بورڈ روم۔ شایان نے عشق آباد کے اس عارضی مٹی کے بند کے ارضیاتی سروے کے کاغذی نقشے ساگوان کی اس چمکدار میز پر پٹخ دیے تھے۔ اس نے اپنی انگلی سے ان نئی تعمیر شدہ لکڑی ہوٹلوں کے نیچے موجود سرخ رنگ کی فالت لائنز کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"یہ ڈھلوان ریاضیاتی طور پر کنکریٹ کے اس بھاری وزن کو سنبھالنے کی سکت ہی نہیں رکھتی،" اس نے حکومتی پلاننگ کمیٹی کو بھی جھنجھوڑا تھا۔ "اگر کوئی شدید ہیٹ ویو آئی یا مومن سون کی تیز بارشیں ہوں، تو یہ پہاڑ کٹ جائے گا۔ اس سے اٹھنے والی پانی کی لہر پورے حیدر پور کو ملیا میٹ کر دے گی۔"

ایک ڈپٹی سیکریٹری نے اپنے لبوں پر ایک روایتی، بیوروکریٹک مسکراہٹ لاتے ہوئے طنز کیا تھا، "مسٹر شایان، یہ ہوٹل غیر ملکی ٹورازم کی مد میں ایک ارب روپے کی سرمایہ کاری ہیں۔ تم ڈیولپمنٹ والے ہمیشہ اتنے ہی سنسنی خیز (alarmist) ہوتے ہو۔ یہ پہاڑ یہاں لاکھوں سال سے قائم ہے۔"

شایان نے اپنے دانت بھیجنے لیے، جیسے ہی وہ پہلے زینے پر پہنچے، سڑیچر پر اس کی گرفت مزید کس گئی۔ اسے نظر انداز کیا گیا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اسے تب نظر انداز کیا گیا جب اس نے محکمہ جنگلات کو سوات کے ٹبر کا رٹلر کے بارے میں خبردار کیا تھا جو مٹی کو کھانے والے صنوبر کا صفایا کر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈیزاسٹر مینجمنٹ کی ایجنسیوں نے اس کی بات ان سنی کردی جب اس نے کہا تھا کہ سندھ کے ساحلوں پر سمندر کی یہ پیش قدمی دس لاکھ کسانوں کو بے گھر کر دے گی۔

ریاست کسی بھی بحران کو بھی مانتی تھی جب اس کے سامنے لاشوں کا انبار لگا ہو۔ وہ ثبوت اور ڈیٹا مانگتے تھے، مگر وہ حکومت صرف لاشوں کے پوسٹ مارٹم (autopsy) پر چلا رہے تھے۔ آج کا یہ منظر کوئی قدرت کی مچی تباہی نہیں تھا۔ حیدر پور کی یہ بربادی تو

بس اسی گہری، نظام میں رچی ہوئی بے حسی کے ایک طویل بے حسی کی ایک خونی رسید تھی۔

"چلتے رہو!" پاریسہ چیخی، اور اس نے شایان کو خیالوں سے واپس اس ہولناک حال میں واپس لا پھینکا۔ ان کے اوپر آسمان بالکل سیاہ تھا، مگر وادی کی آواز کا پورا آہنگ یکلفت بدل گیا۔ وہ دھیمی سی لرزش اب ایک کڑکڑاتے، ہولناک اور روح فرسا دھماکے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ شایان نے جھیل کی طرف دیکھا۔ وہ اس اندھیرے میں کچھ دیکھ تو نہیں پار رہا تھا، مگر وہ اس وقت وہاں ہونے والی تباہی کو پوری طرح محسوس کر سکتا تھا۔ عشق آباد کے اوپر موجود وہ پوری ڈھلوان بیٹھ چکی تھی۔ لاکھوں ٹن مٹی، چٹانیں اور ان پرتعیش ہوٹلوں کے بھاری کنکریٹ کے ڈھانچے ایک ساتھ اس مقفل پانی کے پیٹ میں جا گرے تھے۔

تین سینڈ بعد، اس پانی کی عظیم لہر اس عارضی مٹی کے بند سے ٹکرائی۔ وہ شور قیامت خیز تھا۔ وہ پانی کی گرج نہیں تھی؛ وہ زمین کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز تھی۔ پہاڑی بلبے اور چٹانوں سے بنا وہ ناپائیدار ہند ایک سینڈ کے ہزاروں حصے کے لیے رکا، اور پھر اس سونامی کی وحشیانہ طاقت نے اسے اڑا کر رکھ دیا۔

"نیچے ہو جاؤ! بالکل نیچے!" شایان نے چیخ کر کہا۔ انہوں نے سڑپچر کو چیری کے ایک باغ کے ہموار تودے پر رکھ دیا، جو وادی کے پاٹ سے تقریباً سو فٹ بلندی پر واقع تھا۔ شایان نے پاریسہ کو زمین پر لٹاتے ہوئے کور دینے کی کوشش کی، اور اسی لمحے وادی کو چیرتی ہوئی ہوا کی ایک شدید، دھماکے دار لہر گزری جو اپنے ساتھ کچلی ہوئی چٹانوں کا ایک گلا گھونٹ دینے والا غبار لے کر آئی تھی۔ اور پھر پانی اتر۔ وہ پانی جیسا دکھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کالے اسفالت (کولتار) کی ایک متحرک، جاندار دیوار تھی۔ وہ مٹی، کاربنتی بڑی چٹانوں، صنوبر کے ٹوٹے ہوئے تنے اور ان پانچ لگژری ہوٹلوں کے اسی مڑے ہوئے لوہے اور لٹیر کے بلبے سے بنایا ایک مائع بلڈ وز تھا، جس کے بارے میں ریاست نے قسم کھائی تھی کہ وہ بالکل محفوظ ہیں۔

شایان اور پاریسہ اس اونچے زینے پر گرے، اس مٹی کے طوفان میں کھانستے ہوئے، اپنی آنکھوں کے سامنے حیدر پور کی پوری تاریخ کا جنازہ نکلتے دیکھتے رہے۔ پتھروں کا وہ طوفان چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اس بستی پر ٹوٹا۔ ہوٹلوں کا وہ ٹوٹا ہوا کنکریٹ کسی توپ کے گولوں کی طرح برس رہا، جس نے پتھر اور لکڑی سے بنے ان گھروں کو لٹھوں میں سرمہ بنادیا۔ شایان نے دیکھا کہ پاریسہ کے اس سفید کیونٹی کلینک کی چھت۔۔۔ کسی ہتھوڑے تلے آنے والے چینی کے پیالے کی طرح پاش پاش ہو گئی، اور وہ پوری عمارت اس سیاہ، بھیرے ہوئے بلبے کے پیٹ میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی۔

وہ ایک مکمل تباہی تھی۔ انسانوں کی صدیوں پرانی تاریخ کا وہ پورا رستہ ساٹھ سینڈ سے بھی کم وقت میں بالکل صاف ہو چکا

تھا۔ پاريسہ اس زینے کے کنارے اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی، اس کے ہاتھ مٹی کو جکڑے ہوئے تھے۔ وہ چیخی نہیں۔ اس کی آنکھوں سے کوئی آنسو نہیں نکلا۔ وہ تو بس اس مٹی کے غبار کو چیرتی چاندنی کی دھیمی روشنی میں اس خالی، سیاہ اور ہولناک خلا کو تکتی رہی جہاں تھوڑی دیر پہلے اس کی زندگی کا پورا حاصل قائم تھا۔

شایان اس کے مصلوب وجود کے پاس آیا، اس کا اپنا دل اس لڑکی اور اس بستی کے لیے تار تار رہور ہا تھا۔ اس نے اس کے کندھے پر ایک تسلی آمیز، مضبوط ہاتھ رکھا۔ باکو کا وہ عکس تو سلامت رہا تھا، مگر وہ اپنی پوری دنیا ہار چکی تھی۔

"وہ کلینک"، پاريسہ نے سرگوشی کی، اس کی آواز بالکل کھو گئی تھی۔ "وہ تمام ریکارڈز۔ وہ سولر انکلیوشن سسٹم۔ وہ ادویات۔ سب ختم ہو گیا۔"

"تم نے انسانوں کو بچالیا،" شایان نے جاندار آواز میں کہا، اس کا ہاتھ ان اونچے زینوں کی طرف تھا جہاں سینکڑوں دیہاتی اس اندھیرے میں ایک دوسرے سے چپے کھڑے تھے، صدمے سے چور مگر زندہ۔ "تم نے انہیں محفوظ کر لیا، پاريسہ۔ عمارتیں تو محض پتھر ہوتی ہیں۔ تم نے اس وادی کی دھڑکن بچالی ہے۔"

اس نے شایان کی طرف دیکھا، اس کی سیاہ آنکھوں میں ایک عمیق، لامتناہی دکھ جھلک رہا تھا۔ "ہم یہاں لاوارث ہیں، شایان۔ اب ہمارا کیا ہوگا؟ راستہ ختم ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس نہ کھانا ہے، نہ پینے کا صاف پانی، اور اس پہاڑ پر میرے پاس بچاس زخمی لوگ پڑے ہیں۔ یہ حکومت پہلے تمہاری بات سننے کو تیار نہیں تھی۔ اب وہ ہمارے لیے یہاں کیوں آئے گی؟"

شایان نے اپنی جیب سے بچا کر لایا فون جیب سے نکالا۔ اس کی سکرین چمکی ہوئی تھی اور سگنل کا نشان بالکل دم توڑ چکا تھا۔ مگر اسے وہ آخری اٹھارہ سینڈکار رابطہ اچھے سے یاد تھا جو لائن کٹنے سے پہلے قائم ہوا تھا۔ اسے زوبیہ کی آواز یاد تھی۔ "کیونکہ اس بار میں نے کسی سرکاری باؤکونٹیں پکارا،" شایان نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، اور وہ دل ہی دل میں ان اندھیرے بادلوں کو چرتی کسی ہیلی کاپٹر کے پنکھوں کی برستی ہوئی آواز سننے کی دعا کر رہا تھا۔ "میں نے ایک حقیقی صحافی کو آواز دی ہے۔ اور وہ ضرور اس بات کو یقینی بنارہی ہوگی کہ اس وقت پورا ملک ہماری طرف دیکھ رہا ہو۔"

باب-12

تلاطم کے بعد۔۔

شاہراہ قراقرم کی فضائی حدود۔

اس صبح پورے ملک کی آنکھ کسی روایتی سیاسی ٹاک شو سے نہیں کھلی تھی، بلکہ وہ ایک لائیو اور بغیر کسی سنسر کے چلنے والی سیٹلائٹ فیڈ کو دیکھ رہے تھے جہاں ایک پورا پہاڑ اپنے اندر سے پھٹ کر بہہ رہا تھا۔ ایک پومارہیسکیو ہیلی کاپٹر کے لرزتے ہوئے پیٹ کے اندر بیٹھی زوبیہ قریشی کھڑکی سے نیچے قراقرم کی ان تیکھی، سیاہ اور سنگلاخ چوٹیوں کے پھیلاؤ کو تک رہی تھی۔

اس نے سرمد کو، کارپورٹ بورڈ کو، الغرض پورے نظام کو بائی پاس کر کے عشق آباد جھیل کی تباہی کی وہ لائیو چیو۔ میٹرک رپورٹ ان تمام بڑے اینکرز اور بین الاقوامی نامہ نگاروں تک بیک وقت پہنچادی تھی جو اس کی کانٹیکٹ لسٹ میں موجود تھے۔ اور اس نے یہ معرکہ اکیلے سر نہیں کیا تھا۔

محمد انور صاحب نے اسلام آباد کے ایف سیون فور سے بیٹھے بیٹھے بیوروکریسی اور مقتدرہ میں قائم اپنے دہائیوں پرانے رابطوں کو متحرک کر دیا تھا، اور وہ ہوابازی (aviation) کے وہ براہ راست نمبر اسے فراہم کر رہے تھے جو عام دنیا کیلئے قابل رسائی نہیں ہوتے۔

"یہ پورا ڈیٹا ان تمام مقتدر حلقوں تک ایک ساتھ پہنچاؤ،" انور صاحب نے ایک محفوظ لائن پر اسے گائیڈ کیا تھا، ان کی آواز اس طوفان کے درمیان ایک پرسکون لنگر کی طرح تھی۔ "اس آفت کو نظر انداز کرنے کی سیاسی قیمت ان ہیلی کاپٹروں کو اڑانے کی قیمت سے کہیں زیادہ بڑی کر کے پیش کرو۔ تاکہ ان کے پاس بچانا ہے یا نہیں، والی بحث کی کوئی گنجائش ہی نہ بچے۔"

انور صاحب کی بھرپور معاونت کے ساتھ، زوبیہ نے شاہان کے اس آخری، اٹھارہ سیکنڈ کے ہانپتے ہوئے فون کو ایک ایسی چیخنی ہوئی قومی ہنگامی صورتحال (National Emergency) میں تبدیل کر دیا تھا جس کے آگے پورا نظام ہل کر رہ گیا۔ عوام

کے اس شدید غصے اور رد عمل نے وزیر اعظم ہاؤس کو مجبور کر دیا کہ وہ فجر کے ہنگام ہی ایوی ایشن ونگ کو اڑان بھرنے کا حکم جاری کرے۔

اب وہ اس آفت کے بالکل دہانے کی طرف اڑ رہی تھی، بھاری ہیڈ سیٹ اس کے کانوں پر پریس تھا، اور وہ پائلٹس کی اس ہنگامی اور تیز و تند گفتگو کو سن رہی تھی جو وائز لیس پر گونج رہی تھی۔

"حیدر پور ہمارے سامنے ہے،" پائلٹ کی آواز آئی، اس کی روایتی پیشہ ورانہ سنجیدگی اب بالکل رنو ہو چکی تھی۔ "یا خدا یا۔۔۔ وہ عارضی بند پوری طرح اکھڑ چکا ہے۔ نیچے پوری وادی کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔"

ادھر نیچے وادی کے اندر، دنیا اب صرف ایک بھیا نک، میکا کی اور کان پھاڑ دینے والے شور کا نام تھی۔ شایان ملک گھٹنوں تک اس نینچے پر، پھرے ہوئے کچھڑ کے اندر کھڑا تھا، اور اس کے ہاتھ شدید درد سے چیخ رہے تھے جب وہ ایک چھوٹے ڈرے ہوئے بچے کو اٹھا کر اس اونچے زینے کی طرف منتقل کر رہا تھا۔

اس کے ارد گرد، حیدر پور کے لوگ اپنے وجود سے نسلوں کا بوجھ اتار پھینک رہے تھے۔ مردوں نے لکڑی کے وہ بھاری صندوق وہیں چھوڑ دیے جن میں آباؤ اجداد کی نشانیاں تھیں، عورتوں نے اپنی کمر سے باندھے چاندی کے وہ زیورات (جہیز) وہیں مٹی کے سپرد کر دیے جو انہوں نے عمر بھر سنبھالے تھے۔ آپ اس پتھروں کے طوفان کو کوئی رشوت نہیں دے سکتے تھے۔ آپ صرف اس کے آگے بھاگ سکتے تھے، وہ بھی ایک حد تک۔

پانی ناقابل یقین حد تک تیز رفتاری سے اوپر چڑھ رہا تھا، وہ ان ہوملوں کے پاش پاش ہونے والے کنکریٹ کی مٹی کی وجہ سے بالکل سیاہ اور دبیز ہو چکا تھا۔

"اوپر چلو! جلدی!" شایان اپنی پھٹی ہوئی آواز میں چلایا، اس نے ایک بوڑھے شخص کو کھینچ کر مٹی کے اس پھسلنے توڑے سے اوپر کیا۔ "اوپر چڑھتے جاؤ! پیچھے مڑ کر مت دیکھنا!" چند گز کے فاصلے پر، پارسیہ اس پورے طوفان کے بیچ ایک سائے کی طرح متحرک تھی، اس کا سفید کوٹ مٹی سے بھورا ہو چکا تھا، اور وہ ایک عورت کی ٹانگ سے بہتے خون کو اپنے ہی دوپٹے کے کٹڑے سے باندھ کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ اس بکھرتی ہوئی دنیا کے مرکز میں ایک پرسکون لنگر کی طرح کھڑی تھی۔ مگر جیسے ہی پانی ان اونچے باغات تک پہنچا، اور اس

نے چیری کے ان صدیوں پرانے درختوں کو نگنا شروع کیا، تو ان چوٹیوں پر بھی کھڑے ہونے کی جگہ اب ختم ہونے لگی۔ اور پھر، پانی کے اس ہولناک شور کو چیرتی ہوئی، ہیلی کا پٹر کے پنکھوں کی وہ بھاری اور کڑکڑاتی آواز گونجی۔

تین ریسکیو ہیلی کا پٹر پہاڑ کی اوٹ سے نمودار ہوئے، ان کی تیز سرچ لائٹس نے مٹی کے اس گہرے غبار کو تلواریوں کی طرح چیر کر رکھ دیا۔ مگر ان پنکھوں کا دباؤ خود ایک ہتھیار بن چکا تھا، جس سے درخت بری طرح لرز رہے تھے اور کچھ نما مٹی نیچے کھڑے لوگوں کی حدنگاہ کو نہ ہونے کے برابر کر رہی تھی۔ پہلا ہیلی کا پٹر اس سب سے چوڑے اور اونچے زینے کے بالکل اوپر ہوا میں معلق ہو گیا، وہ اس ناہموار ڈھلان پر اتار تو نہیں سکتا تھا مگر اس نے اپنی ریسکیو باسکٹ نیچے اتار دی۔

ایک کمانڈو نے دروازے سے باہر جھکتے ہوئے میگافون پر اپنی آواز کو پوری قوت دی "عورتیں، بچے اور زخمی! پہلے آگے آئیں!" وہ انخلا حد درجہ سہا دینے والا اور افراتفری سے بھرپور تھا۔ شایان اور وادی کے نو جوانوں نے ایک انسانی زنجیر بنالی تھی، وہ بچوں کو ہاتھوں ہاتھ آگے بڑھا رہے تھے، انہیں اس اندھی کر دینے والی دھول اور ابھرتے پانی کی نخبستہ بو چھاڑ سے بچا رہے تھے۔ شایان نے لپک کر پاریسہ کو بازو سے تھاما جب وہ باسکٹ چوتھی بار نیچے آئی۔

"جاؤ! اندر بیٹھو!" پاریسہ نے اپنے قدم وہیں مٹی میں جما لیے، ہوا اس کے بالوں کو پوری شدت سے اس کے چہرے پر اڑا رہی تھی۔ اس نے باسکٹ کو دیکھا، پھر پیچھے چوٹیوں پر پھنسے ان انسانوں پر نظر دوڑائی، اور آخر میں اس کی نظریں شایان پر جم گئیں۔ اس کی آنکھیں ایک دم گھونٹ دینے والے سچ سے پھیل چکی تھیں۔ وہ ہیلی کا پٹروں سے ریسکیو کے عمل کو اچھے سے جانتی تھی۔ وہاں نہ تو اتنا وقت بچا تھا اور نہ ہی ان ہیلی کا پٹروں میں اتنی گنجائش موجود تھی۔

پاریسہ ہیلی کا پٹر کے اس شور میں کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی، اس نے شایان کی جیکٹ کو جکڑ لیا تھا: "میں آپ کو یہاں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی! آپ میرے لیے واپس آئے تھے! میری وجہ سے یہاں پھنسے ہو!"

"میں یہاں اس لیے ہوں کیونکہ یہاں ہونا میرا فرض تھا، پاریسہ!" شایان نے اس کے کندھوں پر یقین دلانے کے انداز میں ہاتھ رکھا اور پوری قوت سے جواب دیا۔ اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے باکو کا وہ عکس نظر آیا، مگر اس سے کہیں زیادہ، اسے وہ ذہین، سرکش اور غیور ڈاکٹر نظر آئی جس نے اس وادی کو اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔

"تمہارے لوگوں کو تمہاری زندگی کی ضرورت ہے، پاریسہ۔ انہیں دوبارہ کھڑے ہونے کے لیے تمہارا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"شایان، خدا کے لیے۔۔۔"

"ضد مت کرو!" وہ زور سے چلایا، اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرنے کی کوشش کی، ایک ایسا یقین پیش کرتے ہوئے جو اس کا اپنا دل بھی نہیں مان رہا تھا۔

"میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی رستہ نکال لیتا ہوں۔ اب جاؤ۔" اس سے پہلے کہ وہ اس سے لڑپاتی، شایان نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور باسکٹ میں کھڑے اس کمانڈو کی جانب دھکیل دیا۔ جیسے ہی وہ باسکٹ اسے اوپر ہیلی کا پٹر کے پیٹ کی طرف کھینچنے لگی، پاریسہ نے اپنا ہاتھ نیچے اس کی طرف بڑھایا، اس کا پورا چہرہ گہرے تاسف میں ڈوبا ہوا تھا۔

شایان پیچھے ہٹا، اور اس نے مسکراتے ہوئے اسے اپنا آخری اور فوجی انداز کا سلیوٹ پیش کیا۔ اسی لمحے پانی کا ایک اور شدید ریلہ آیا۔ ایک ایسا خوفناک ریلہ جس نے اس زینے کے نچلے حصے کو مٹی سمیت اکھاڑ پھینکا۔ "شایان! پل کی طرف بھاگو!" گاؤں کے ایک بزرگ نے آواز دی۔ باقی بچے مرد۔ جو تعداد میں بمشکل ایک درجن ہوں گے۔ ان کے پاس اب وادی کا آخری سرہ ہی بچا تھا: لکڑی اور لوہے کے تاروں سے بنا وہ پرانا معلق پل (suspension bridge) جو اس گہری کھائی کے آ پار کافی اونچائی پر بنایا گیا تھا۔ صرف وہی ایک زمین تھی جو اب تک سطح آب سے اوپر تھی۔

شایان اس چوٹی پر چڑھا، اس نے آخری شخص کو کھینچ کر اس لکڑی کے تختوں پر پہنچایا اور اسی لمحے پانی نے اس زمین کو بھی نگل لیا جہاں وہ تھوڑی دیر پہلے کھڑے تھے۔ وہ اس معلق پل کے کٹہرے پر قید ہو چکے تھے، جو اس بچہ بھرے ہوئے، سیاہ اور ہولناک سمندر کے اوپر لٹک رہا تھا۔ پل چٹخ رہا تھا، اس کے پرانے لوہے کے تار اس بے کراں ہوا اور بڑھتے پانی کے دباؤ تلے کر بار بار ہبے تھے۔

اوپر فضا میں، زوبیہ کا ہیلی کا پٹر اس مٹی کے غبار کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ زوبیہ اپنی سیٹ پیلٹ اور ہارنس کے سہارے اس کھلے دروازے سے باہر ادھی لٹک رہی تھی، منہ بستہ ہوا اس کے چہرے کو کاٹ رہی تھی۔ اس نے نیچے پھیلی اس ہولناک قیامت کا جائزہ لیا۔ کلیٹک غائب تھا۔

بازار کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں صرف گر جتا ہوا کالا پانی تھا۔ اور پھر، ہیلی کا پٹر کی اس سرچ لائٹ کے پورے فوکس کے بیچ، اسے وہ منظر نظر آیا۔ وہ معلق پل۔ چند انسان جو اس لوہے کے تاروں کو جکڑے کھڑے تھے۔ اور اس پل کے بالکل بیچوں بیچ کھڑا، اوپر چمکتی روشنی کی طرف دیکھتا ہوا۔۔۔ شایان تھا۔

"وہاں! اس پل پر! رسیاں نیچے پھینکو!" زوبیہ اپنے ہیڈ سیٹ پر پروڈیوسر اور پائلٹ پر چلائی، اس کا ہاتھ دیوانہ وار نیچے اشارہ کر

رہا تھا۔ پائلٹ نے ہیلی کاپٹر کا رخ بدلا، وہ اس سیلاب کی وجہ سے پیدا ہونے والے شدید فضائی دباؤ اور ہوا کے تھپڑوں سے لڑ رہا تھا۔

"یہاں بہت زیادہ turbulence ہے! میں اتنی نیچے ہور (hover) نہیں کر سکتا! یہ پل کے تار ہمارے پنکھوں سے ٹکرا جائیں گے!"

"نیچے لے کر جائیں! آپ کو کوشش کرنی ہوگی!" زوبیہ نے التجا کی، اس کا دل اس کے سینے کی ہڈیوں کو توڑ دینے کی حد تک دھڑک رہا تھا۔ اس نے نیچے دیکھا، اس کی نظریں شایان کے اس عکس پر جم چکی تھیں۔ شایان نے اپنے اوپر ہوا سے لڑتی اس عظیم مشین کو دیکھا۔ وہ دیکھ تو نہیں سکتا تھا کہ اس کے اندر کون ہے، مگر وہ اچھے سے جانتا تھا کہ وہ وہیں موجود ہے۔ وہ جانتا تھا کہ میڈیا آچکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ پورا ملک اس وقت اس ایسے کولائیڈ کیوڈ کھڑا ہے۔ اس نے ریاست کو اس پہاڑ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا، خواہ اس کی قیمت اس کا اپنا وجود ہی کیوں نہ ہو۔

اور پھر، پتھروں کے اس طوفان نے اپنا آخری اور کاری وار کیا۔ ان ہوٹلوں کے کنکریٹ کا ایک بہت بڑا مبلہ، جسے وہ سیاہ پانی میلوں سے اپنے ساتھ بہا کر لارہا تھا، سیدھا اس معلق پل کے بنیادی پتھر کے ستون سے ٹکرایا۔ وہ ٹکراؤ کوئی فلمی منظر نہیں تھا، وہ حد درجہ تیز، میکائیکی اور وحشیانہ تھا۔ اس کی آواز کسی توپ کے فائر جیسی تھی۔ پل کا مرکزی لوہے کا تار چٹخا، اور ایک زخمی سانپ کی طرح فضا میں لہرایا۔ ہیلی کاپٹر کے اندر کھڑی زوبیہ کے حلق سے ایک ایسی چیخ نکلی جسے پنکھوں کے شور نے اسی لمحے نگل لیا۔

اس نے پل کو بیچ سے ٹوٹتے دیکھا۔ لکڑی کے وہ تختے ایک لہر کی شکل میں پاش پاش ہوئے۔ سرچ لائٹ کی اس تیز، چمکدار لکیر کے بیچ، وہ تمام انسان ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے فضا میں معلق دکھے۔ ان کا وہ آخری، سرکش عکس جو اس پوری دنیا کے مٹ جانے کے آگے بالکل بے خوف کھڑا رہنے کا تھا۔ شایان کی نظریں اوپر چمکتی اس روشنی پر ہی جمی رہیں، اس کا چہرہ پرسکون تھا، اور اس کی پوری زندگی کی محنت اس پانی کے ہولناک شور میں ایک ابدی گونج بن چکی تھی۔ اور پھر نیچے سے پانی کا غبار اٹھا، موٹا، گہرا اور ناقابلِ دید، اور وہ پورا معلق پل اس بھرے ہوئے سیاہ اندھیرے کے پیٹ میں ہمیشہ کے لیے غرق ہو گیا۔

ہیلی کاپٹر گھنٹوں اس کھائی کے اوپر چکر کاٹتا رہا، اس کی سرچ لائٹ اس بھرے ہوئے، خالی اور میالے پانی کی سطح پر کسی نشان کو ڈھونڈتی رہی۔ مگر وہاں کوئی پل نہیں تھا۔ وہاں کوئی کنارہ نہیں بچا تھا۔ وہاں صرف پانی تھا، جو بڑی تیزی سے جنوب کی طرف بہا چلا جا رہا تھا، اور اپنے ساتھ اس بدلتی ہوئی دنیا کی وہ بھاری، ان کہی اور خونی قیمت لے کر جا رہا تھا جن کا حساب کسی کے پاس نہیں تھا۔

"سرچ لائٹ کی اس تیز لکیر کے نیچے معلق وہ آخری معرکہ اب ایک گہرا راز بن چکا تھا۔ کیا دریا کے اس مٹیا لے جھاگ نے شایان کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا تھا، یا اس ہولناک اندھیرے کے بیچ باہر نکلنے کا کوئی آخری، ناممکن راستہ موجود تھا؟ طوفانی ریلے تو بس اسی طرح گرجتے رہے، لیکن زوہبیہ کے کانوں میں ہیلی کاپٹر کے شور کو چیرتی شایان کی وہ آخری سرگوشی گونج رہی تھی: 'تم جانتی ہو زوہبیہ۔۔۔ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہوں'۔"

وہ راستہ کہاں تھا، یہ تو دریائے نہیں بتایا؛ لیکن اس نئی ہوئی وادی کے افق پر شایان کے نام کی ایک ابدی گونج باقی تھی جو اب پہاڑ سے بڑے حوصلے والی ان عورتوں کے وجود کا حصہ بن چکی تھی جو ریگستانوں، ساحلوں، اور پہاڑوں کو بچانے کے تمام معرکوں میں پیش پیش رہیں۔ جو لاوارث مٹی پر، اپنے فولادی اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ بقا کی اگلی جنگیں لڑنے کے لیے پورے وجود اور حوصلے کے ساتھ کھڑی باقی رہ گئیں تھیں۔"

اس کتاب کے بارے میں: طوفان بلا خیز سے پہلے، جس کا انگریزی ورژن 'Before the Valley' (Drowns) پہلے ہی شائع ہو چکا ہے، پاکستان کو درپیش ان بحرانوں کا ایک طاقتور اور لرزادینے والا احاطہ ہے جہاں نظام کی مجرمانہ غفلت اور ماحولیاتی زوال ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ پالیسی امور کے ماہر شایان ملک اور تحقیقاتی اینکرو ڈوبیہ قریشی کے کرداروں کے گرد گھومتا یہ بیانیہ ان ملک تک کرتی گھڑیوں کے بارے میں خبردار کرتا ہے جو اس ملک کے مستقبل کے خطرے میں ہونے کی علامت ہیں۔ سوات میں ٹبر ماہیا کی بے لگام کٹائی سے اٹنے والے پتھروں کے طوفان (اسٹون فلڈ) سے لے کر، وسطی پنجاب میں غیر قانونی ہجرت (ڈکٹی) کے خونی راستوں اور جھل گسی میں بجڑی خشک سالی اور ایچ ایچ ایچ کے ایسے تک یہ ناول کاغذی بیوروکریسی کی بے بسی اور اس کی انسانی قیمت کو بے باکی سے سامنے لاتا ہے۔ یہ کتاب وقت کی ایک ناگزیر پیکار ہے، جو اپنی بھلا اور وقار کی جنگ لڑنے والے فرنٹ لائن ورکرز اور مقامی برادریوں کے ناقابل شکست عزم کو ایک شاندار خراج تحسین پیش کرتی ہے۔



ادارے کے بارے میں: فریڈم گیٹ پراسپرٹی (FGP) پاکستان میں کمپینز ایکٹ 2017 کے سیکشن 42 کے تحت رجسٹرڈ، قومی سطح پر تسلیم شدہ ایک غیر منافع بخش اور فلاحی ادارہ ہے۔ اسلام آباد میں قائم اپنے مرکزی ہیڈ کوارٹر کے ساتھ، ایف جی پی (FGP) ملک بھر میں نو جوانوں، خواتین اور معاشرے کے پسماندہ و محروم طبقوں کو ماحولیاتی اقدامات، سب کی شمولیت پر مبنی ترقی اور شہری شمولیت کے ذریعے با اختیار بنانے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ ادارہ تحقیق، جدید تربیت اور مقامی برادریوں کی سطح پر شروع کیے جانے والے اقدامات کے ذریعے ماحول دوست روزگار (green livelihoods)، کاروباری صلاحیتوں (entrepreneurship) اور جمہوری شرکت کو فروغ دیتا ہے۔ پالیسی سازی اور زمینی نفاذ کے درمیان حائل فاصلوں کو مٹا کر، ایف جی پی ایسے عملی حل فراہم کرتا ہے جو پائیدار، دور رس اور مثبت سماجی و معاشی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ انسانی وقار، یکساں مواقع اور پائیداری کی اعلیٰ اقدار پر کار بند فریڈم گیٹ پراسپرٹی ایک ذمہ دار، پائیدار اور حقیقی معنوں میں مستحکم و خوشحال پاکستان کی تعمیر کے لیے پوری طرح پرعزم ہے۔



مصنف کے بارے میں: شفقت عزیز ملک اسلام آباد میں مقیم پالیسی ڈیولپمنٹ اور سٹریٹجک پالیسی (Policy Development and Strategic Narratives) کے ایک ماہر اور سینیئر ایڈوائزر ہیں، اور اس وقت فریڈم گیٹ پراسپرٹی (FGP) میں بطور سٹریٹجک پالیسی ایڈوائزر اپنی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔ ترقیاتی شعبے، پالیسی اصلاحات اور موسمیاتی ہتھکنڈ (climate change resilience) کے میدان میں اپنے وسیع اور طویل مدتی تجربے کی بدولت ان کا بنیادی کام نظام کی پیچیدہ کمزوریوں کو ایک اثر انگیز اور عملی ایڈووکیسی میں تبدیل کرنا ہے۔ ان کا یہ ناول، 'طوفان بلا خیز سے پہلے'، پاکستان کی سیاسی، ماحولیاتی اور بیوروکریٹک منظر ناموں میں فرنٹ لائن پر کام کرنے اور ان نچتے ہوئے راستوں پر گزرا سے گئے ان کے اپنے دہائیوں کے طویل، حقیقی اور گہرے تجربات کا نچوڑ ہے۔

